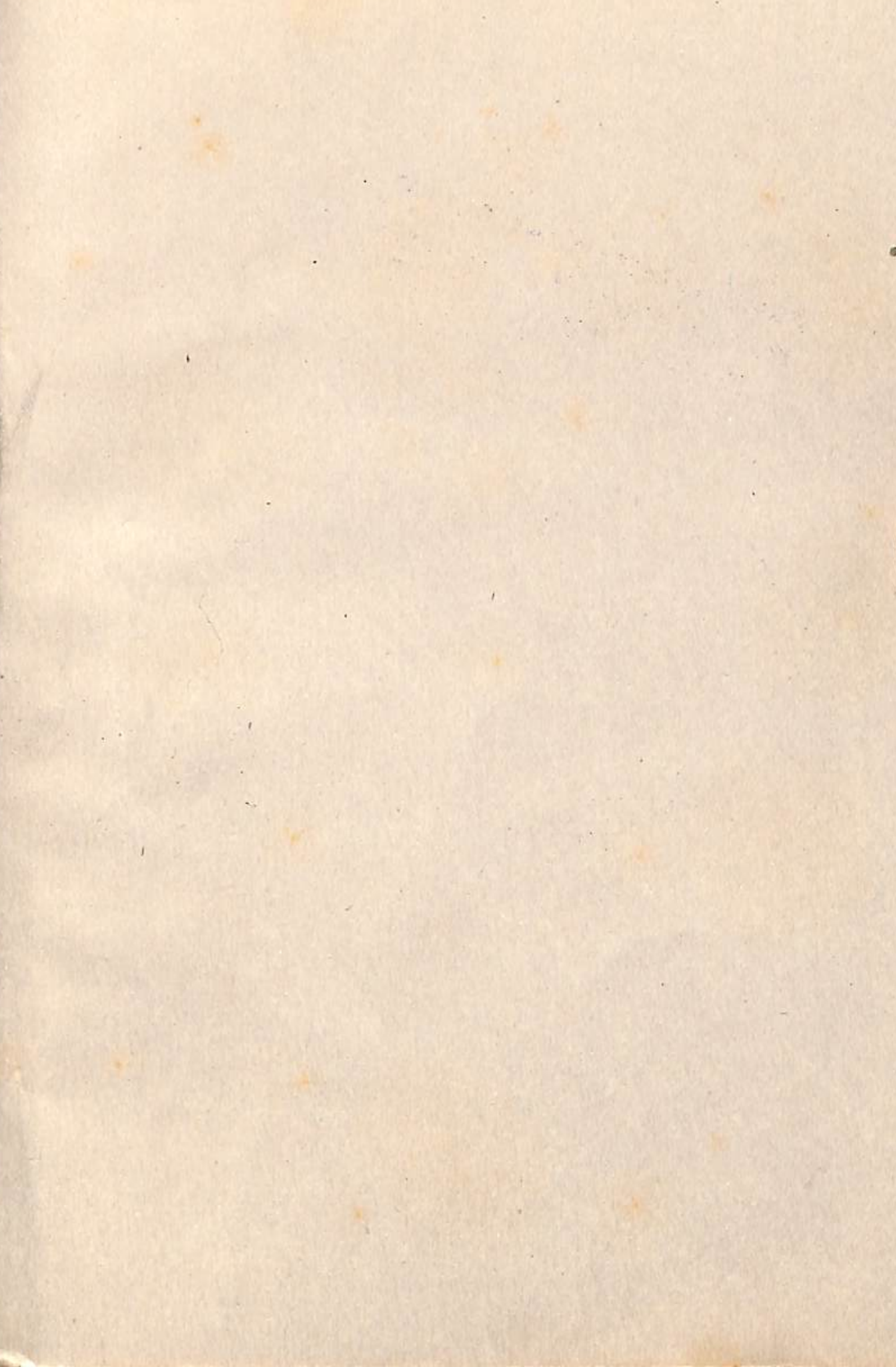
مہاتما گاندھی کا پیغام

مرتب و مولف

یو۔ایس۔موہن راؤ

پبلیکیشنز ڈویژن







مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی
کا پیغام

مرتب و مؤلف
یو۔ ایس۔ موہن راؤ

پبلیکیشنز ڈویژن
وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ ہند

اکتوبر ۱۹۶۹ء
آسون ۱۸۹۱

مہاتما گاندھی کی تحریروں کے اقتباسات نوجیون ٹرسٹ احمد آباد
کی اجازت اور شکریے کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں

ناشر: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن۔ پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۔۱
طابع: بنگال پریس، پلی بنگش، دہلی۔۶

مہاتما گاندھی
کا پیغام

مہاتما گاندھی کی صد سالہ سالگرہ کی
تقریب پر شائع کردہ

راشٹرپتی بھون

نئی دہلی

۲ ستمبر ۱۹۶۸ء

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سری یو. ایس. موہن راؤ نے "مہاتما گاندھی کے پیغام" کے عنوان سے مہاتما گاندھی کے افکار و خیالات کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے کو ترتیب دینے میں مرتب کا مقصد اور کوشش یہ رہی ہے کہ اس مہان گرو کا سندیش جن اقدار پر مشتمل ہے وہ مربوط شکل میں سامنے آئے اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جدوجہد آزادی کے زمانے میں اپنے پیروکاروں کو جو خاص ہدایتیں دی تھیں اُن کا مجموعہ بھی مرتب ہو جائے۔ گاندھی جی کی تعلیمات اُس وقت کے لئے نہایت مناسب اور قابلِ قبول تھیں۔ لیکن ان میں ایک ایسا فلسفۂ زندگی بھی ہے جو ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لئے برموقع اور حسب حال ہے۔

بیس سال کے بعد، ان کی تحریروں کے تازہ مطالعے پر مبنی یہ انتخابات جس طرح کئے اور پیش کئے گئے ہیں اُن سے گاندھی جی کے معروف افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ نسبتاً کم معروف خیالات بھی موثر ڈھنگ سے پیش ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

(دستخط)

ذاکر حسین

فہرست عنوانات

THE MESSAGE OF NAHATMA GANDHI (Urdu)

Not for sale

تعارف

بعض وجوہ سے آج تک یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہے کہ اگرچہ گاندھی جی عوام کے رہنما کی حیثیت سے قابلِ قدر اور بے حد کامیاب تھے اور ایک فقیر منش انسان تھے لیکن سیاست، معیشت، تعلیم اور سماجی مسائل سے متعلق ان کے خیالات فرسودہ تھے اور سائنس اور ٹکنالوجی کی وجہ سے تیزی سے بدلتی ہوئی اس دُنیا میں اُن کی کوئی جگہ نہیں ہے

یہ خیالات کتنے غلط ہیں اس کا اندازہ اُن کی تحریروں کے مطالعے اور اُن کی تعلیمات کے نچوڑ کی ترتیب و تدوین سے ہو سکتا ہے۔ انسانی تاریخ میں بڑے بڑے سادھو سنت، فلسفی، دانش ور، سائنس داں، مدبّر اور سیاسی رہنما گذرے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے دائرہائے کار میں بڑے نمایاں کام کئے ہیں لیکن گاندھی جی اپنے طریقۂ کار میں یکتا تھے۔ اپنے ملک کو غیر ملکی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے ایک عوامی جدوجہد کی رہنمائی کرتے ہوئے انھوں نے سوراجیہ کا تصوّر، انفرادی اور سیاسی معنوں میں پیش کیا اور غور و فکر اور تجربے کے بعد ایک ایسا نظام زندگی مرتب کیا جو ہمیشہ کے لئے صحیح اور مناسب تھا۔ بہت سے سماجی مسائل کا جو حل انھوں نے پیش کیا وہ اپنی سادگی کی وجہ سے بڑا حیران کُن ہوتا تھا اور بہت سے لوگوں کو شش و پنج میں ڈال دیتا تھا کہ وہ کارگر ہوگا کہ نہیں۔

گاندھی جی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب کی وجہ سے اُن کی زندگی اور تعلیمات میں ساری دُنیا کی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تعلیمات

کا مبتور مطالعہ کیا جائے۔ حالانکہ گاندھی جی اپنے رویے میں آدرش وادی تھے لیکن اپنے آدرشوں کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں وہ بے حد عملی آدمی تھے سچائی اور عدم تشدد جیسے بنیادی اصولوں میں وہ بالکل اٹل تھے لیکن اُن اصولوں کا نفاذ مسلسل تجربوں کے بعد کرتے تھے۔ نزاعی مسائل کو حل کرنے کے معاملے میں اُن کا طریقہ کوئی ایک یا قطعی نہیں ہوتا تھا، اور مزید تجربہ کرنے کے بعد اُن میں بہتری لائی جا سکتی تھی۔

مختصر یہ کہ گاندھی جی ایک سماجی مصلح تھے جس نے سماج کی برائیوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور تمام حقائق اور متعلقہ شخصیات کے سیاق میں اُن کا علاج ڈھونڈنے کی سعی کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض امور کے معاملے میں اُن کے خیالات وقت سے آگے تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے وہ ناقابلِ عمل بھی دکھائی دیتے ہوں۔

گاندھی جی کی تحریروں کے اقتباسات آٹھ عنوانوں کے تحت جمع کئے گئے ہیں پہلے باب میں خدا کے بارے میں ان کے تصور اور اُن کے غیر متزلزل عقیدے سے متعلق خیالات جمع کئے گئے ہیں ”خدا تھا، خدا ہے اور ہمیشہ رہے گا“، اُن کے نزدیک خدا کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے بلکہ اُس کا گھر انسانوں کا دل ہے ”ایک زندہ موجود قانون (خدا)، جس کی اطاعت میں پوری دُنیا حرکت کر رہی ہے، میں عقیدہ رکھے بغیر ایک بھرپور زندگی ناممکن ہے۔ خدا میں عقیدے کے بغیر انسان اس ایک قطرے کی طرح ہے جسے سمندر سے نکال دیا گیا ہو اور جس کا فنا ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ انسان کو جو چیز صحیح اور جائز کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ خدا کی ہستی ہے۔ موجودات کا خلاصہ اور مجموعہ خدا کی ذات ہے۔“

گاندھی جی کی طاقت کا سرچشمہ خدا کی ذات میں اُن کا یقین واثق تھا۔ انھیں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کی ذات ایک بڑی معمولی اور ادنیٰ ذات ہے۔ اور صرف وہی جانتا ہے کہ ان سے کس طرح کام لے، کس طریقے سے کام لے، اور کس حد تک کام لے۔

ہر آزمائش کے بعد خدا کی ذات میں اُن کا عقیدہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ خدا نے میری باتیں نہیں سنیں۔ جب اُفق پر کالے بادل چھائے ہوتے تھے جیل خانے میں مجھے طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہونا پڑتا تھا اور جب کڑی صبر آزما مرحلے آتے تھے تو میں نے ہمیشہ اسے اپنے نزدیک پایا ہے۔ میری زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب مجھے ایسا لگا ہے کہ خدا نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

گاندھی جی کی دو بنیادی تعلیمات۔ سچائی اور عدم تشدد۔ کو دوسرے باب میں جمع کیا گیا ہے۔ سچائی میں ان کا بے پناہ عقیدہ صرف زبان تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ بڑے خلوص اور سچی لگن کے ساتھ اس پر عمل کرتے رہے حتیٰ کہ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ "سچائی خدا ہے" انھیں اپنے ملک سے بے پناہ محبت تھی لیکن وہ سچائی کی قیمت ادا کر کے ملک کی آزادی کے لئے بھی آمادہ نہ تھے۔

سچائی اور اہنسا کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ سچائی کے متلاشی کو لازماً اہنسا کے راستے پر چلنا ہے کیونکہ اہنسا کا حصول سچائی پر سختی سے عمل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ گاندھی جی کے نزدیک اہنسا کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہونچایا جائے بلکہ یہ ایک مثبت چیز ہے۔ محبت کا قانون عالمی ہے۔ خواہ افراد ہوں یا قومیں اُن کی بھلائی اہنسا کے

راستے پر چلنے میں ہے۔ یہ راستہ صرف رشیوں اور منیوں کے لیے نہیں ہے بلکہ عام آدمیوں کے لیے بھی ہے۔

وہ اس نظریے سے بالکل متفق نہ تھے کہ اگر مقصد جائز اور درست ہو تو اس کے حصول کے لیے کیسے ہی ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ گاندھی جی جس اہنسا کا پرچار کرتے تھے اور جس پر وہ ساری زندگی نہایت کامیابی کے ساتھ خود عامل رہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے کمزوری یا بے بسی کے مترادف سمجھا جائے۔ عدم تشدّد بہادری کی معراج ہے۔ اس میں بزدلی اور کمزوری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ بزدلی کے مقابلے میں تشدّد کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ "اس کا امکان ہے کہ تشدّد پر عامل شخص کسی دن عدم تشدّد کو اپنائے مگر ایک بزدل کے لیے ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔"

اُن کی زندگی اور تعلیمات سے یہ سبق سیکھنا چاہئے کہ کسی بھی شخص کے خلاف کوئی بُرائی یا دشمنی کا جذبہ نہیں ہونا چاہئے۔ کسی کو بھی اپنا دشمن نہیں سمجھنا چاہئے۔ کسی شخص کے دل میں جو زہر ہے ہمیں اس کے خلاف لڑنا چاہئیے اور اس کو ختم کرنا چاہئیے۔

گاندھی جی نے انفرادی کردار اور گروہوں اور قوموں کے کردار میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اگر تشدّد افراد کے درمیان غلط ہے تو قوموں کے درمیان بھی غلط ہے۔ ستیہ گرہ میں جو سچائی اور عدم تشدّد پر مبنی ہے، استحصال کنندہ کی شخصیت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور جب جیت حاصل ہوتی ہے تو نہ ہار کی ندامت محسوس ہوتی ہے اور نہ جیت کا فخر۔

محبت کرنے اور دکھ اُٹھانے کے پیچھے جو جذبہ ہے اُسے گاندھی جی بہت

بہت پسند کرتے تھے کسی مخالف کو اپنا ہم خیال بنانے کا سب سے پسندیدہ اور موثر طریقہ یہ ہے کہ زور زبردستی کے بجائے نرمی سے سمجھایا جائے۔ اس لئے سچائی کا پرچار کرنے میں دوسروں کو کوئی سزا دینا غلط ہوگا۔ اس کے برعکس یہ بالکل درست ہوگا کہ اس مقصد کے لئے جسے ہم صحیح سمجھتے ہیں ہم خود تکلیف اٹھائیں۔ اپنے آپ کو تکلیف دینا اپنے خیالات کے پرخلوص ہونے کی ضمانت بن جاتا ہے۔ اس طریقے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اگر ہم صحیح راستے پر نہ ہوں تو اُس کی وجہ سے ہم خود بھی صحیح راستے پر آجاتے ہیں۔ اس طرح عدم تشدد کا راستہ جمہوریت کا راستہ ہے۔

ایسے نظام میں جس میں تشدد کی کارفرمائی ہو ہم اپنے آپ کو محفوظ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی وجہ سے اسلحہ بندی کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے یا ہمیں نہایت بے بسی کے ساتھ طاقتور قوموں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ عدم تشدد کے تحت تکلیف اور دکھ اٹھانے کی خواہش اور آمادگی سے طاقت ملتی ہے۔ اور اس کے لئے کسی جسمانی طاقت یا اسلحہ کی ضرورت نہیں ہے۔ گاندھی جی کے اپنے الفاظ میں تشدد کی تربیت میں مارنے کا فن سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح عدم تشدد پر عمل کرنے کے لئے مرنے کا فن سیکھنے کی ضرورت ہے۔ جنگ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو سزا دی جائے اور مغلوب کر لیا جائے تاکہ وہ خوف سے فاتح کی مرضی کا تابع ہو جائے لیکن اہنسا کا مقصد یہ ہے کہ غلط کام کرنے والے کو صحیح راستے پر لایا جائے اور پھر ایک نیا اور منصفانہ سماجی نظام قائم کرنے میں اس کی مدد کی جائے۔ عدم تشدد کے ذریعہ لڑی جانے والی جنگ کا خاتمہ آپس کی رضامندی پر ہوتا ہے، اس میں کسی پر حکم نہیں چلایا جاتا اور نہ ہی مخالف کو کوئی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔

گاندھی جی بہت سے موقعوں پر ستیہ گرہ کی جس میں اس وسیع و عریض ملک

کے لاکھوں مردوں اور عورتوں نے حصہ لیا۔ اُن کو قابو میں رکھنا اور اہنسا کے راستے پر چلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے باوجود اُن لوگوں نے جس طرح (گاندھی جی کے کہنے کے مطابق) عمل کیا وہ ایک معجزہ ہے۔

سچائی اور اہنسا پر مبنی ستیہ گرہ پر عمل کرنا اُن معنوں میں ایک بالکل نیا تجربہ تھا کہ سماجی اور سیاسی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لئے اتنے وسیع پیمانے پر اس اصول کو انسانی تاریخ میں پہلی بار بروئے کار لایا گیا۔ بعض مرحلوں پر یا بعض حلقوں میں اس کے نفاذ میں کچھ کمیاں رہ گئیں وہ اس عظیم الشان تجربے کے مقابلے میں ناگزیر تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ تجربہ بذاتِ خود ناکام ر اور اس سے دست بردار ہو جانا چاہئے۔

تیسرے باب کے مندرجات "عقائد اور قدریں" زیادہ تر خود نوشت سوانح کی حیثیت رکھتے ہیں: "میری زندگی ایک غیر منقسم اکائی ہے اور تمام سرگرمیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان سب کا منبع انسانیت کی محبت سے متعلق میری کبھی نہ بجھنے والی پیاس ہے" گاندھی جی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی ذات کی طرح عزیز رکھتے تھے اور اپنے آپ کو عام انسانوں سے کسی طرح بلند یا بہتر خیال نہیں کرتے تھے۔ سچائی کی تلاش و جستجو میں اُن کی زندگی ایک مسلسل ریاضت تھی۔ سچائی کا حصول اُن کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اسی وجہ سے وہ مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کی پاکیزگی پر بھی بضد تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ علی الاعلان اپنی چھوٹی بڑی غلطیوں کا اعتراف بھی کر لیتے تھے۔

عدم سچائی کی ایک شکل ناانصافی بھی ہے: "سچائی کی لگن ہی مجھے سیاست

کے میدان میں لے آئی ہے۔ میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر لیکن بڑی انکساری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ مذہب کا مطلب کیا ہے۔"

گاندھی جی کے لیے مذہب اور اخلاق ایک ہی چیزیں تھیں۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی کیونکہ گاندھی جی ایک کرم یوگی (باعمل انسان) تھے۔ مذہب کو زندگی کی دوسری باتوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر شخص دوسرے مذاہب کا اتنا ہی احترام کرے جتنا وہ خود اپنے مذہب کا کرتا ہے۔ کیونکہ مذہب کا مطلب 'فصل' نہیں 'وصل' ہے۔ چوتھے باب میں گاندھی جی کے ایسے ہی خیالات جمع کئے گئے ہیں، کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ سچائی کسی ایک مذہبی کتاب کی اجارہ داری نہیں ہے۔

گاندھی جی کا ہندو مت کا تصور، رامائن کی اخلاقیات اور اپنشد اور بھگوت گیتا کی بصیرت پر مبنی تھا۔ انھوں نے ان کتابوں کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالا تھا۔ "میں انسانیت کی خدمت کے ذریعے خدا کے دیدار کا متمنی ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ نہ بہشت میں ہے اور نہ نیچے ہے بلکہ ہر شخص میں ہے۔"

گاندھی جی ایک ہندو تھے لیکن انھوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ عیسائیت کے بلند پایہ اخلاقی اصول اور اسلام کا مکمل برابری اور مساوات کا سبق اُن کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ اسی طرح بدھ مت کے محبت، نیکی اور امن کے پیغام نے بھی اُن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بار بار انھوں نے تمام مذاہب کی صداقت کا اعلان کیا ہے اور اپنی زندگی رواداری کی ایک روشن مثال

بنا کر پیش کی ہے۔

تبدیلیٔ مذہب کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے کہا ہے: "ہمیں ایک ہندو کو اچھا ہندو، ایک مسلمان کو اچھا مسلمان ایک عیسائی کو اچھا عیسائی بننے میں مدد دینی چاہیئے۔ ہمیں اپنے دلوں سے یہ خیال نکال دینا چاہئے کہ ہمارا مذہب زیادہ سچا ہے اور دوسروں کا کم ہے۔ تمام مذاہب کے متعلق ہمارا رویہ بالکل صاف اور مخلصانہ ہونا چاہیئے۔"

گاندھی جی کا خیال تھا کہ عبادت مذہب کی روح اور اس کا نچوڑ ہے۔ وہ عبادت کو بے حد ضروری خیال کرتے تھے کیونکہ اس سے ہماری روزانہ کی زندگی میں نظم و ضبط اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔

غریب، نادار اور دبے کچلے ہوئے لوگوں کا انہیں بے حد خیال تھا اور وہ اُن کی بھلائی و بہبود کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ پانچویں باب میں غریب عوام سے متعلق اُن کے خیالات جمع کئے گئے ہیں۔ اُن کے بارے میں اُن کا رویہ سر پرستانہ یا جذباتی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اُن کی بھلائی کے خواہاں تھے۔ اسی وجہ سے وہ برابر اُن کے بارے میں لکھتے اور سوچتے رہے۔

انھیں یقین تھا کہ انسانوں کی اکثریت کا مقدر غریبی اور افلاس نہیں ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ دولت ان لوگوں میں منصفانہ طور پر تقسیم کر دی جائے جو اُسے پیدا کرتے ہیں۔ کسی بھی مزدور کسان کو روٹی، کپڑے اور مکان جو زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں، سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔

وہ کسی شکل میں بھی استحصال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ارد گرد پھیلی

معاشی نابرابری اور سماجی ناانصافی کو دور کرنے میں اپنی پوری طاقت لگا دی۔ انھوں نے بالکل صاف لفظوں میں کہا ہے کہ وہ غیر ملکی یا مقامی سامراجیت میں کوئی فرق نہیں کرتے! اور چاہتے ہیں کہ ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو روک دیا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب سرمایہ دار اپنے آپ کو مزدوروں کا امین اور متولی سمجھیں۔ ان کے مطابق مزدور ملوں کے اتنے ہی مالک ہیں جتنے اس کے حصے دار ہیں۔ اور اگر مِل مالک اس بات کو سمجھ لیں تو پھر دونوں میں کسی جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ وہ مزدوروں کو برابری کا درجہ بھی دینا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ صدیوں سے مزدوروں کو نیچا سمجھا گیا ہے جیسے ہی مزدور تعلیم یافتہ اور منظم ہو جائیں گے، انھیں اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا اور پھر سرمایے کی کوئی طاقت انھیں دبا نہیں سکے۔ سرمایے اور محنت میں کسی آویزش کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرمایہ دار مزدوروں کو دبائیں نہیں۔ اگر سرمایہ دار اپنے کو مزدوروں کا امین نہ سمجھیں اور اُن کا استحصال کرتے رہیں۔ تو کیا کیا جائے ؟ ستیہ گرہ اس کا بالکل صحیح جواب ہے۔ اہنسا کے ذریعے سرمایہ داروں کا نہیں، سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مزدوروں کو جو کچھ ملے اُن کے حق کے طور پر ملے۔ خیرات کے طور پر نہیں۔ خیرات لینے والے اور دینے والے دونوں کو گراوٹ کا شکار بناتی ہے۔

گاندھی جی مشینوں کی اندھا دھند تنصیب کے خلاف تھے۔ "میں ہر اس سائنسی ایجاد کی قدر کرتا ہوں جس سے سب کا بھلا ہو۔" مگر ایسی مشینوں کے خلاف تھے۔ جس سے بڑے پیمانے پر مزدوروں کی چھٹی ہو جائے اور چند ہاتھوں میں طاقت آجائے۔ بہرحال وہ ایسی بھاری مشینوں کے حق میں تھے جو وہ کام کریں جو آدمی کے بس میں نہیں ہے

مگر چونکہ وہ ایک اشتراکی تھے اس لئے چاہتے تھے کہ ایسے تمام کارخانے جس میں کافی تعداد میں لوگ کام کرتے ہیں وہ قومی ملکیت میں ہوں۔ انھیں عوام کی بھلائی کے لئے کام کرنا چاہیے۔

"خدا نے انسان کو اپنی روٹی کمانے کے لئے تخلیق کیا ہے اور جو لوگ بغیر کام کئے کھاتے ہیں وہ چور ہیں"، روٹی کمانے کے لئے محنت کرنے سے متعلق ٹالسٹائی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے گاندھی جی کے ان خیالات کی تصدیق ہوئی جو رسکن کی کتاب کے مطالعے کے بعد ان کے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ بھگوت گیتا کے تیسرے باب میں بھی اس قسم کی تحریر ملی جس میں کہا گیا تھا کہ جو شخص قربانی دئے بغیر کھاتا ہے وہ چوری کا مال کھاتا ہے۔ گاندھی جی نے قربانی کا مفہوم جسمانی محنت، روٹی کے لئے محنت لیا ہے۔ ہر شخص خواہ وہ کسی مرتبے یا صلاحیت کا ہو اسے روٹی کے لئے محنت کرنی ضروری ہے۔ یہ فرد کی صحت، خوشی اور طمانیت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہماری بہت سی سماجی برائیاں اس اصول پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں افراد کے لئے زندگی محنت و مشقت اور نیم فاقہ کشی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ لوگ روٹی کے لئے، محنت کے قانون پر رضا کارانہ طور پر عمل کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ مجبور ہیں اور یہ جبر غریبی، بیماری اور بے اطمینانی پیدا کرتا ہے۔ یہ غلامی ہے۔ کوئی کروڑ پتی بھی کسی قسم کی محنت یا جسمانی ورزش کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر ہر شخص کو محنت ہی کرنی ہے تو کیوں نہ یہ پیداواری محنت یعنی روٹی کے لئے محنت کی شکل میں ہو، انہوں نے اپنی مثال سے ثابت کر دکھایا کہ ہاتھ سے کام کرنا کوئی گھٹیا کام نہیں ہے۔

گاندھی جی ساری انسانیت کے لئے خیرسگالی کے جذبات رکھتے تھے مگر اپنی جنم

بھومی سے انھیں خاص لگاؤ تھا چھٹے باب کا یہی موضوع ہے ۔ اس باب کو مزید ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

گاندھی جی نے ملک کو متحد کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے ۔ انھوں نے بالکل واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جو لوگ یہاں رہتے ہیں خواہ اُن کا تعلق کسی مذہب سے ہو اس مشترکہ گھراور عظیم وراثت میں برابر کے حصہ دار ہیں اور اُن کے حقوق و فرائض مساوی ہیں ۔ "مذہب، انسان اور خدا کا آپس کا معاملہ ہے" جہاں تک اُن کی قومیت کا تعلق ہے وہ ہندوستانی ہیں خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو ۔" اُن کی موت و زندگی اُن کی وسیع القلبی اور رواداری کا مظہر تھی ۔

انھوں نے کہا تھا کہ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تنظیم کو ہندوستان کی وحدت کے لیے خطرہ نہیں بننا چاہیے :" اگر ہر صوبہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ اور خود مختار اکائی سمجھے تو ہندوستان کی آزادی بے معنی ہوجائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان ملحقہ اکائیوں کی آزادی بھی ختم ہو جائے گی ۔ دُنیا والے ہمیں گجراتی، مراٹھی یا مدراسی وغیرہ کی حیثیت سے نہیں جانتے بلکہ وہ ہمیں صرف ہندوستانی سمجھتے ہیں ۔ اس لیے ہمیں نہایت سختی کے ساتھ تمام نفاق پسند رجحانات کی ہمت شکنی کرنی چاہیے اور آپ اپنے کو ایک ہندوستانی کی طرح سمجھنا اور کام کرنا چاہیے ۔"

وہ ملک کے لاکھوں آدمیوں کی غریبی اور رہن سہن کے نہایت افسوس ناک حالات دیکھ کر بے حد رنجیدہ تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ملک کے بسنے والے ۴۰ کروڑ افراد کو کم از کم زندگی کی بنیادی ضرورتیں حاصل ہوں اور آزاد ہندوستان میں انھیں برابر کے حقوق اور مواقع حاصل ہوں ۔ انھیں یقین تھا کہ ہندوستان شہروں میں نہیں سات لاکھ

گاؤوں میں ہے۔ وہ شہروں کے بے تحاشا پھیلاؤ کو تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسے ایک غیر صحت مند علامت سمجھتے تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ شہر کی رونق گاؤں والوں کے استحصال کی وجہ سے ہے اور یہ کہ شہر کے پڑھے لکھے لوگ سیدھے سادھے گاؤوں والوں کی طرف مربیانہ رویہ رکھتے ہیں۔ انھیں یقین کامل تھا کہ اگر ہندوستان کو آزادی حاصل کرنی ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ لوگوں کو شہروں کے بجائے گاؤں میں اور محلوں کے بجائے جھونپڑیوں میں رہنا ہوگا۔

گاندھی جی کے کہنے کے مطابق ہمارے ملک کی وسعت اور آبادی کی کثرت، اس کا جغرافیائی محل وقوع اور آب و ہوا سبھوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی تہذیب دیہی تہذیب ہو۔ فی الحال اس تہذیب میں بہت سے نقائص ہیں مگر انہیں دور کیا جاسکتا ہے ان تمام نقائص کو دور کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوان گاؤوں میں بسیں، اور گاؤں والوں کو وقت صحت اور پیسے کی بچت سکھائیں۔ صدیوں سے گاؤں کا استحصال ہوتا رہا ہے اور اب وہ زوال پذیر ہیں۔ لہٰذا ملک کے ہر بہی خواہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس زوال پذیری کو روکے یا دوسرے الفاظ میں گاؤوں کی تعمیر نو کرے تاکہ یہاں ہر شخص آسانی سے رہ سکے۔"

انھیں اس کا بھی افسوس تھا کہ پڑھے لکھے گاؤں والے بھی شہری زندگی کی چکاچوند کا شکار ہو جاتے ہیں اور شہروں میں بسنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے، انھوں نے دیہی حرفوں اور صنعتوں کی تجدید کی زبردست کوششیں کیں تاکہ گاؤں والے خود کفیل بن جائیں اور خود اعتمادی حاصل کرسکیں۔ گاؤں والوں کو اپنی ضرورت کے لیے، خود اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہیے، شہروں پر نہیں۔

شہروں کی دولت گاؤں والوں کا خون نچوڑ کر حاصل کی گئی ہے۔" میں خود ایک گاؤں واسی ہوں اور گاؤں کی حالت سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اوپر سے اگر دباؤ پڑے گا تو نیچے والے کچلے جائیں گے۔" اسی لیے وہ کھادی اور چرخے کی اہمیت پر زور دیتے تھے بعضوں کے لیے۔ چرخے کے ذریعے معاشی حالت سدھارنے کی کوشش قابل قبول نہ ہونے پر ایسا سمجھا جاسکتا تھا اگر وہ گاؤں والوں کی حالت سدھارنے کے لیے چرخے کو واحد ذریعہ قرار دیتے۔ مگر انھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اُن کا مقصد یہ تھا کتائی اور بنائی کو قدیم زمانے میں زرعی پیشے کے معاون کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل تھی وہ دوبارہ حاصل ہو جائے تاکہ جب وہ کھیتی باڑی کے کام میں نہ لگے ہوں تو چرخہ کات سکیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس سے گاؤں والے اپنی قلیل آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کر سکتے ہیں اور اپنے کپڑے پر خرچ کی بچت کر سکتے ہیں۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے سارے ملک میں کپڑے کی گھریلو صنعت بڑے اچھے ڈھنگ سے چل رہی تھی مگر انھوں نے اس صنعت کو تباہ کر دیا۔ گاندھی جی اس صنعت کی تجدید چاہتے تھے۔ پرانے اور فرسودہ چرخے کو دوبارہ زندہ کرنے کی بجائے اُن کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے لاکھوں کروڑوں آدمی کپڑے کی کتائی اور بنائی کے ذریعے اپنی آمدنی میں اضافہ کریں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی دولت کو باہر جانے سے روک سکتے ہیں۔

آزادی کا صحیح لطف اٹھانے کے لیے ہمیں رضاکارانہ طور پر نظم و ضبط کو اپنانے کا راز سیکھنا چاہیے۔ نظم و ضبط، رواداری اور ایک دوسرے کا احترام کیے بغیر جمہوری زندگی ناممکن ہے۔ آزادی کی اعلا ترین صورت زبردست ڈسپلن اور انکساری کی متقاضی ہے۔

گاندھی جی انفرادی آزادی چاہتے تھے۔ مگر انسان چونکہ سماجی جانور ہے اس لئے اسے اس آزادی پر نہایت احتیاط کے ساتھ عمل کرنا چاہئے۔ انفرادی آزادی کے نام پر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا بالکل غلط اور غیر جمہوری طریقہ ہے۔ "ہم صحیح جمہوری مزاج پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ناروا داری کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ ناروا داری سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے مقصد میں یقین نہیں ہے۔" ناروا داری اہنسا کی ایک شکل ہے اور صحیح جمہوری مزاج کے پروان چڑھنے میں مزاحم ہے۔ "ہمیں ہمیشہ اپنے مخالف کی باتیں سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے اعتقادات پر بے خوفی سے ڈٹے رہیں وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھیں اور اس کے لئے تیار رہیں جو کچھ ہم سچ سمجھتے ہیں وہ کہیں غیر سچ تو نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ صرف اس کا فیصلہ صحیح ہے۔ ہم سے غلطیاں سرزد ہونے کا احتمال ہے اور اکثر ہمیں اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنے یا اپنے سابقہ فیصلوں کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد یا افراد کے مجموعے کو اپنے خیالات کے اظہار کی پوری آزادی ہونی چاہئے لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم مخالف کے نقطۂ نظر کو بھی سمجھیں اور اگر ہم اسے قبول نہیں کر سکے۔ تو اس کا اتنا ہی احترام کریں جتنا کہ ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے خیالات کا احترام کریں۔"

گاندھی جی کے مطابق صحیح جمہوریت جھوٹ اور اہنسا کی بنیاد پر نہیں قائم ہو سکتی جمہوریت کا جذبہ باہر سے لادا نہیں جا سکتا۔ اسے دل کے اندر پیدا ہونا چاہئے۔ جمہوریت میں کمزور کو وہی مواقع حاصل ہونے چاہئیں جو طاقت ور کو ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی ملک غریبوں کے تئیں سوائے سرپرستی کے رویے کے کوئی صحیح رویہ نہیں رکھتا۔ اچھوتوں کے لئے جنھیں

وہ ہری جن کہتے ہیں گاندھی جی کے دل میں بڑی دیا تھی اور انھوں نے اُن کی بھلائی کے لئے نہایت غیر معمولی خدمت انجام دی ہے چھوت چھات کا خاتمہ گاندھی جی کی زندگی کا اہم ترین مقصد تھا "میں جو چاہتا ہوں اور میں جس بات کے لئے زندہ ہوں اور جس بات کے لئے مجھے اپنی جان دینے میں خوشی ہوگی وہ یہ ہے کہ چھوت چھات جڑ بنیاد سے ختم ہو جائے۔"

انھوں نے ان مندروں میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا جن میں ہریجنوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

عورتوں کے لئے مہاتما گاندھی کے دل میں بڑی قدر اور عزت تھی۔ وہ عورتوں کو قربانی اور تیاگ کا مجسمہ سمجھتے تھے۔ اہنسا کا مطلب ہے غیر محدود محبت اور اس کا مطلب ہے دکھ اور تکلیف جھیلنے کی بے پناہ صلاحیت، اور یہ صلاحیت، عورت، مرد کی ماں سے زیادہ کس میں ہے؟ "اُن کا خیال تھا کہ ہندو کلچر نے یہ غلطی کی ہے کہ اس نے بیوی کو شوہر کا بالکل تابعدار بنا دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ بیوی شوہر کی ذات میں مدغم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض اوقات شوہر بیوی کے حقوق غصب کر لیتا ہے اور بالکل وحشی کی طرح اس پر حکم چلاتا ہے۔"

عورتوں کے حقوق کے بارے میں گاندھی جی کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ عورتوں اور مردوں کے مکمل برابری کے حامی تھے اور لڑکے اور لڑکیوں کو بالکل مساوی درجہ دینا چاہتے تھے۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم علاقائی زبانیں ہوں اور ملک سے رابطے کی زبان ہندی ہو۔ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستانی "آسان

ہندی اور اُردو الفاظ کی مرکب" ہی ہندوستان کے عام لوگوں کی زبان ہو سکتی ہے۔ یہ زبان صوبوں کے درمیان مراسلت، کے لئے نہایت موزوں ہے۔" میں ہندوستانی کی حمایت میں جمار ہوں گا۔ خواہ میں اس حمایت میں تنہا ہی رہ جاؤں"۔ دوسروں کے ساتھ بھلائی کا جذبہ ہمارے اندر موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مناسب ڈھنگ سے اس جذبے کو پروان چڑھائیں۔ "سب سے اعلیٰ اخلاقی قانون یہ ہے کہ ہم ہمیشہ انسان کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ گاندھی جی کے ایسے خیالات ساتویں باب میں درج کئے گئے ہیں۔ انسانوں کی بلا غرض خدمت زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ ہمیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ دوسروں کی بھلائی میں خود ہمارا بھلا بھی ہے۔ ایک ایسا شخص جو دوسروں کی خدمت میں لگا ہو اُسے اپنے آرام و آسائش کے بارے میں سوچنے کا موقع بہت کم ہوگا "اگر ہم سمجھ لیں کہ ہمارے اندر ایک روحانی طاقت ہے تو ہمیں دُنیا میں خدا کے علاوہ کسی اور سے خوف نہیں ہوگا۔"

گاندھی جی محسوس کرتے تھے کہ ایک حد تک جسمانی آرام ضروری ہے۔ ایک حد تک ذہنی ضرورتیں بھی پوری کی جاسکتی ہیں۔ مگر ان تمام ضرورتوں کو اس حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے ورنہ پھر وہ جسمانی اور ذہنی تعیش کے حدود میں داخل ہو جائیں گی۔

"دماغ ایک بے چین پرندہ ہے جتنا اسے ملے گا اس سے زیادہ یہ چاہے گا اور اس کے بعد بھی غیر مطمئن رہے گا۔" انسان کو سچی خوشی قناعت میں ملے گی۔ اس لئے انھوں نے برہم چریہ پر بہت زور دیا ہے۔ برہم چریہ کا مطلب اُن کے نزدیک وہ طرزِ عمل ہے جو خدا کے نزدیک لاتا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حواس خمسہ پر پورا قابو پایا جائے"۔ ان کا خیال ہے کہ مکمل تجرد کی زندگی بڑی اچھی صورت ہے لیکن اگر کوئی ایسا نہ کر سکے تو

اُسے شادی ضرور کرنی چاہئے مگر اس کے باوجود ضبط سے کام لینا چاہیئے

گاندھی جی کی زندگی اور تعلیمات ساری دُنیا کے لئے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک رُوحانی اور اخلاقی طاقت تھے جس نے انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ وہ مذہب، قوم یا نسل کے نام پہ کوئی تفریق روا نہ رکھتے تھے وہ بین الاقوامیت میں گہرا یقین رکھتے تھے اور بُنیادی طور سے تمام انسانوں اور قوموں کو ایک سمجھتے تھے

آٹھویں اور آخری باب میں اُن کی تحریر کا یہ اقتباس درج ہے۔ "خدا نے میری تقدیر ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ وابستہ کرتی ہے۔ میں اپنے خالق کے تئیں اپنے فرض میں ناکام رہوں گا۔ اگر میں اُن کی خدمت نہ کروں اگرچہ مجھے معلوم نہیں ہے وہ کہ انسانیت کی خدمت کس طرح کروں اور جب تک اپنے ملک کی خدمت کرتے ہوئے میں غلط راستے پر نہیں چلا جاتا اس وقت تک میں دوسری قوموں کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ وہ ہندوستان کو خاص طور پر پسند کرتے تھے اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ یہ ملک دُنیا کو تیاگ اور قربانی کی راہ دکھائے گا۔

خدا کی ذات کو دوام ہے

ایک پراسرار قوت جس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی، دُنیا کی ہر چیز میں پنہاں ہے۔ میں اسے محسوس کر سکتا ہوں اگرچہ میں اُسے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ قوت اپنی موجودگی کا احساس کرا دیتی ہے پھر بھی اُسے ثابت نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ جن چیزوں کا احساس مجھے حواس خمسہ کے ذریعے ہو سکتا ہے یہ ان سے مختلف ہے۔ یہ بات دلیل و حجت سے ماورا ہے مگر اس کے باوجود خدا کے وجود کے بارے میں دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مجھے اس امر کا ایک دھندلا سا احساس ہے کہ میرے گرد و نواح میں ہر چیز میں ہر لمحے تبدیلی آتی رہتی ہے اور وہ ختم ہوتی رہتی ہے لیکن ان تبدیلیوں کی تہ میں ایک ایسی زندہ قوت موجود ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی جو سب کو ایک لڑی میں پروئے رکھتی ہے، جو تخلیق کرتی ہے ختم کرتی ہے اور پھر پیدا کرتی ہے۔ یہ قوت یا روح خدا ہے۔ چونکہ وہ تمام چیزیں جنہیں میں اپنے حواس خمسہ کے ذریعے دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں دائم رہنے

والی نہیں ہے اس لئے صرف اسی کی ذات قائم و دائم ہے۔

کیا یہ طاقت مجسم رحمت ہے یا نقصان پہنچانے والی ہے میں اسے مجسم رحمت سمجھتا ہوں کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ موت کے بعد زندگی باقی رہتی ہے جھوٹ کے درمیان سچائی اور اندھیرے میں اُجالا باقی رہتا ہے، اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خدا، زندگی سچائی اور راستی ہے۔ وہ محبت ہے۔ اس کی ذات اچھائی اور نیکی کی انتہا ہے۔

خدا ایک ایسی طاقت ہے جسے ہم سب محسوس کرتے ہیں لیکن جسے ہم جانتے نہیں۔ میرے نزدیک خدا سچائی اور محبت ہے۔ اخلاق خدا ہے۔ بے خوفی خدا ہے۔ خدا زندگی اور روشنی کا منبع ہے مگر اس کے باوجود وہ اُن سب سے پرے اور بالاتر ہے۔ خدا ہمارا ضمیر ہے۔ حتیٰ کہ وہ منکر کی دہریت میں بھی ہے۔ الفاظ میں اور دلائل کے ذریعے اس کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اس کی ذاتی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہیں وہ اُن کا ذاتی خدا ہے۔ جو لوگ اُس کا لمس چاہتے ہیں اُن کے لئے وہ جسم اختیار کر لیتا ہے۔ وہ خالص ترین رُوح ہے۔ وہ صرف ان کے لئے ہے جو اس میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ ہر انسان کے لئے ہر چیز ہے۔ وہ ہمارے اندر ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم سے پرے اور بالاتر ہے۔ وہ صابر ہے لیکن جابر بھی ہے۔ اس کے نزدیک لاعلمی کوئی بہانہ نہیں، اور اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ معاف کرنے والا بھی ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیں پچھتانے اور نادم ہونے کا موقع دیتا ہے۔ وہ سب سے بڑا جمہوریت پرست ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیں نیکی اور بدی میں سے کسی ایک کو چننے کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ وہ سب سے بڑا جابر بھی ہے کیونکہ وہ اکثر ہمارے ہونٹوں کے قریب پہنچنے کے بعد پیالہ ہم سے چھین لیتا ہے۔ اور بظاہر اس کام کے ذمہ دار ہم خود ہوتے ہیں۔ اس طرح ہماری بے بسی اس کی تفریح

کا باعث ہوتی ہے۔ اس لئے ہندو مذہب میں ایسی باتوں کو اس کی لیلا کہا گیا ہے۔

اگر خدا اپنی مخلوقات کو اس قابل بنا دے کہ وہ اس کے وجود کو ثابت کر دیں تو وہ خدا نہیں رہے گا۔ لیکن وہ اپنے سچے غلام (بھگت) کو سخت ترین آزمائشوں کا سامنا کرنے کی طاقت عطا کرتا ہے۔ میں نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اس سخت گیر آقا کا غلام رہا ہوں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز زیادہ صاف سنائی دیتی رہی ہے۔ اس نے تاریک ترین لمحات میں بھی کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے کئی مرتبہ خود مجھ کو مجھ ہی سے بچایا ہے۔ اور مجھ میں آزادی کا نشان تک باقی نہیں رہنے دیا۔ میں جتنا زیادہ اس کے تابع ہوتا رہا ہوں۔ مجھے اتنی ہی زیادہ مسرت حاصل ہوتی رہی ہے۔

بہت سے ایسے مظاہر ہیں جن کی بنیاد پر آپ خدا کے وجود کے حق میں عقلی استدلال پیش کر سکتے ہیں لیکن اس طرح کی عقل پر مبنی کوئی دلیل پیش کر کے میں آپ کی ذہانت کی توہین نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تمام دلائل کو ایک طرف کر کے خدا کی ذات پر بچوں کی طرح اعتقاد رکھیں۔ اگر میں موجود ہوں تو خدا بھی موجود ہے۔ میرے وجود کے لئے اس کا وجود لازمی ہے۔ اور یہی بات دوسرے کروڑوں انسانوں کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ اگر کسی نے سچ مچ خدا کی آواز کو سنا ہے تو پھر اس کے لئے "بھولنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسے کہ وہ شخص جس نے تیرنا سیکھ لیا ہو پھر اُسے بھول نہیں سکتا۔ اس آواز کو سننے سے لوگوں کی زندگیاں ہر روز زیادہ مالا مال اور پُر مسرت ہوتی جاتی ہیں۔ خدا کی آواز سننے میں یہ پہلو مضمر ہے کہ سننے والا اس کا اہل ہو اور یہ اہلیت

مسلسل اور مستقل کوشش اور خدا کی خدمت گزاری سے پیدا ہوتی ہے۔ شنکر آچاریہ نے اس عمل کو گھاس کے ایک تنکے کے سرے اتنی چوڑی نالی کے ذریعے سمندر کو خالی کرنے کی کوشش سے تشبیہ دی ہے۔ اس طرح یہ عمل ایک کبھی نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ جو کہ ایک کے بعد دوسرے جنم میں جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کوشش بالکل اسی طرح قدرتی ہونی چاہیے جس طرح سانس لینے، آنکھیں جھپکنے کا عمل ہمارے عمل کے بغیر خود بخود جاری رہتا ہے۔ یہ کوشش زندہ رہنے کے عمل سے مطابقت رکھتی ہے میں آپ سے سفارش کرتا ہوں کہ آپ اس ابدی تلاش کے عمل کو جاری رکھیں۔ کیوں کہ اسی طریقے سے ہم خدا کو پا سکتے ہیں

جسمانی لحاظ سے ہمارا وجود بالکل عارضی ہے ابدیت کے آگے ایک سو سال کا عرصہ کیا اہمیت رکھتا ہے لیکن اگر ہم انانیت کی زنجیروں کو توڑ دیں اور انسانیت کے سمندر کا جزو بن جائیں، تو ہم اس کی عظمت کے حصے دار بن جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ہم بھی کچھ ہیں، اپنے اور خدا کے درمیان فصیل کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔ اور اس خیال کو دل سے نکال دینا کہ ہم بھی کچھ ہیں، خدا کی ذات میں مدغم ہو جانے کے برابر ہے۔ سمندر کا ایک قطرہ بھی اس کی عظمت کا حصے دار ہوتا ہے۔ اگرچہ خود اُسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن جونہی یہ سمندر سے الگ ہو کر اپنا آزاد وجود قائم کرتا ہے، یہ خشک ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زندگی پانی کا ایک بلبلہ ہے تو اس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی نہیں ہوتی۔

خدمت کی زندگی لازمی طور پر عجز و انکساری کی زندگی ہونی چاہیے۔ جو شخص اپنی زندگی دوسروں کے لئے قربان کر سکتا ہے اس کے پاس اپنی بھلائی یا بہتری کے

کے لیے سوچنے کا وقت نہیں ہوتا۔ انکساری کو چھوڑ دیا بے عملی سے غلط ملط نہیں کرنا چاہئے جیسے کہ ہندوازم میں کیا گیا ہے۔ صحیح معنوں میں عجز و انکساری سے مراد بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے مسلسل اور زبردست کوشش ہے خدا ہمیشہ ایک لمحہ کے آرام کے بغیر باعمل رہتا ہے۔
اگر ہم اس کی خدمت کرنا چاہتے ہیں یا اس کی ذات میں مل جانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی اس کی طرح جہدِ مسلسل میں لگے رہنا چاہئے۔ جو قطرہ سمندر سے علیحدہ ہو گیا ہے اُسے تو تھوڑی دیر کے لیے آرام مل سکتا ہے لیکن جو قطرہ سمندر کے پانی کا ہی حصہ ہے اُسے آرام کبھی نہیں مل سکتا۔ یہی حالت ہماری ہے جب ہم خدا کی صورت میں سمندر کا ایک قطرہ بن جاتے ہیں تو ہمارے لیے آرام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور نہ ہی ہمیں آرام کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری نیند بھی ایک عمل کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ ہم دل میں خدا کا خیال لے کر سوتے ہیں۔ یہی بے چینی درحقیقت صحیح آرام وسکون ہے۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی حرکت ہی شانتی کی کنجی ہے۔ مکمل خودسپردگی کی اس کیفیت کو بیان کرنا مشکل ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ انسان نے اس کیفیت کو محسوس نہ کیا ہو یا نہ کر سکتا ہو۔ بہت سے سچے بھگت اس کیفیت یا حالت کو پا چکے ہیں، اور ہم بھی اُسے حاصل کر سکتے ہیں۔

بلاشبہ زندگی کا مقصد اپنے آپ کو پہچاننا ہے ہم تب تک ایسا نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم تمام زندگیوں کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر لیں۔ اِن تمام زندگیوں کا مجموعہ خدا ہے علاوہ اس کے اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خدا تمام زندگیوں کے اندر موجود ہے۔ اس کا عرفان بے غرض اور بے پناہ خدمت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

میں اس قول کی سچائی میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتّہ بھی ہل نہیں سکتا۔ میں اس بارے میں کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا کہ بدی کا وجود کیوں ہے۔ ایسا کرنے کی خواہش خدا کے برابر درجہ کرنے کی خواہش کے مترادف ہوگی میں اپنے آپ کو

اس حد تک حقیر سمجھتا ہوں کہ میں ایسے ہی بدی کے وجود کو تسلیم کرلیتا ہوں۔

میں خدا کو بہت دُکھ درد جھیلنے والا اور صابر اس لئے کہتا ہوں کہ وہ دُنیا میں بدی کے وجود کی اجازت دیتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے اندر کوئی بدی نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اگر بُرائی موجود ہے تو وہی اُس کا خالق ہے مگر ایسا ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل پاک وصاف ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں خدا کو کبھی سمجھ نہیں سکوں گا اگر میں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی بدی کے خلاف نہیں لڑتا۔ میرے محدود تجربے نے میرے اس اعتقاد کو اور بھی پختہ کردیا ہے۔ میں اپنے دل کو جتنا پاک کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی مجھے خدا سے قربت کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ مجھے اور کتنا قرب چاہیے جبکہ میرا عقیدہ محض دکھاوا نہیں، جیسا کہ آج کل ہے، بلکہ ہمالیہ کی طرح اٹل ہے اور اس قدر سفید اور چمکدار ہے، جتنا کہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر پڑی ہوئی برف۔ دریں اثنا میں نیومین کے ساتھ ہم آواز ہو کر یہ دُعا کرتا ہوں جو اُس نے اپنے تجربے کی بنا پر کی تھی:

اے رحمدل اور مہربان روشنی، میں غم واندوہ کے اندھیرے میں گھرا ہوا ہوں، میری رہبری کر، تو میری رہنمائی کر۔

رات اندھیری ہے اور گھر سے بہت۔ دُور ہوں تو میری رہنمائی کر

میرے پاؤں ڈگمگانے نہ دے۔ میں کسی دُور دراز کے منظر کو دیکھنے کا متمنی نہیں ہوں۔

میرے لئے ایک قدم آگے بڑھانا ہی کافی ہے

میں نے رُوئے زمین پر کسی کو اس قدر سخت گیر نہیں پایا جس قدر کہ خدا ہے۔ وہ آپ کی مسلسل آزمائش کرتا رہتا ہے۔ اور جب آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ

کا اعتقاد کمزور پڑ رہا ہے، یا آپ کے جسم میں کمزوری آرہی ہے اور آپ ڈوبتے جا رہے ہیں، تو وہ کسی نہ کسی طرح آپ کی مدد کو پہنچتا ہے اور آپ پر یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ آپ اپنے اعتقاد کو متزلزل نہ ہونے دیں اور وہ ہمیشہ آپ کی پکار سننے کو تیار رہتا ہے۔ لیکن ایسا وہ اپنی شرائط پر کرے گا آپ کی شرائط پر نہیں۔

خدا عظیم اور رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں پر آزمائش کا اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جسے وہ برداشت ہی نہ کر سکیں۔

جب ہم زندگی کے سفر میں آگے قدم بڑھاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمیشہ فیصلے کے لئے ہمارے سامنے آتا رہتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا اس وقت بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب شیطان کی آواز قریب قریب خدا کی آواز کے برابر پہونچ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر خدا کی ذات میں اعتمادِ کلی مکمل پاکیزگی اور انتہائی انکساری ہی ہمیں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔

جوانی کے ابتدائی دنوں میں مجھے خدا کے ایک ہزار نام جیسا کہ ہندوؤں کی متبرک کتابوں میں درج ہے، دُہرانے کا سبق دیا گیا تھا۔ لیکن ایک ہزار ناموں کی یہ فہرست کسی طرح مکمل نہیں ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے، اور میرا خیال ہے کہ یہی سچائی ہے، کہ خدا کے اتنے ہی نام ہیں جتنی اس کی مخلوقات ہیں۔ اس لئے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کا کوئی نام نہیں اور چونکہ خدا کی کئی شکلیں ہیں اس لئے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس کی کوئی شکل نہیں، اور چونکہ وہ کئی زبانوں کے توسط سے ہم کلام ہے اس لئے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بولتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس طرح جب میں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسلام میں خدا کے بہت سے نام ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا محبت ہے میں اُن کے ساتھ مل کر یہ کہوں گا کہ خدا محبت ہے

لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں میں یہ کہا کرتا تھا کہ اگرچہ خدا محبت ہے تاہم سب سے بڑھ کر وہ سچائی ہے اگر کسی انسان کے لئے یہ بیان کرنا ممکن ہے کہ خدا کیا ہے تو میں کہوں گا کہ خدا سچائی ہے۔ دو سال پیشتر میں نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہا تھا کہ سچائی خدا ہے۔ اِن دونوں بیانوں سے کہ خدا سچائی ہے اور سچائی خدا ہے، کے درمیان جو لطیف امتیاز موجود ہے، آپ اُسے سمجھ سکتے ہیں۔ میں سچائی کی مسلسل اور ان تھک کھوج کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، اس کا آغاز میں نے آج سے پچاس برس پہلے کیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ سچائی کو پانے کا سب سے نزدیکی راستہ محبت ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریزی زبان میں لفظ محبت کے کئی معنی ہیں اور کہ انسانی محبت جس کی بُنیاد ہوس پر ہو وہ انسان کو نیچے پہنچانے والی چیز بن سکتی ہے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہنسا، سچائی کو محبت کے معنوں میں سمجھنے والوں کی تعداد دُنیا میں بہت کم ہے لیکن سچائی کے سلسلے میں مجھے دُہرے معنی کی موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوا اور خدا کی ذات سے مُنکر لوگوں نے بھی سچائی کی طاقت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا ہے۔ لیکن سچائی کی تلاش کے جوش میں بعض لوگ خدا کی ذات سے ہی مُنکر ہو گئے۔ جو اُن کے نقطۂ نظر سے ٹھیک ہی ہو گا۔ اس طرح کی دلائل کی وجہ سے ہی میں نے یہ ضروری سمجھا کہ یہ کہنے کی بجائے کہ خدا سچائی ہے، 'سچائی خدا ہے' کہنا چاہیے۔ اب اس صورتِ حال پر بھی غور کرنا چاہیئے، کہ لاکھوں افراد نے خدا کا نام لے کر بے شمار مظالم ڈھائے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی نہیں ہے کہ سائنسدانوں نے سچائی کے نام پر اکثر مظالم نہیں کئے ہیں۔۔۔
ہندو فلسفے میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ صرف خدا کی ہستی موجود ہے اور کسی چیز کا وجود نہیں اور اسلام کے کلمے میں بھی اسی سچائی پر زور دیا گیا ہے

اور اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں صاف طور پر یہ کہا گیا ہے کہ صرف خدا کی ہستی موجود ہے اور کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ درحقیقت سچائی کے لئے سنسکرت کے لفظ "ست" کے معنی بھی "وجود" کے ہیں۔ اس وجہ سے اور دیگر کئی باتوں کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے نزدیک یہ تعریف کہ "سچائی خدا ہے" سب سے زیادہ اطمینان بخش ہے۔ اور جب آپ سچائی کو خدا کے رُوپ میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں تو اُس کا واحد ذریعہ محبت یعنی عدم تشدّد ہے۔ اور چونکہ میرا اعتقاد ہے کہ انجام کار مقاصد اور ذرائع کی اصطلاحیں باہم متبادل اصطلاحیں ہیں، اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیئے کہ خدا محبت ہے۔

سچائی کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے، لیکن میں نے اپنے لئے اس کا حل یہ کہہ کر تلاش کر لیا ہے کہ آپ کے اندر سے جو آواز آئے وہ سچائی ہے۔ آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ پھر مختلف لوگ سچائی کے بارے میں مختلف خیال کیوں رکھتے ہیں جو ایک دُوسرے سے متضاد بھی ہیں؟ یہ دیکھتے ہوئے کہ انسانی دماغ مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے اور اُس کا ارتقا ہر ایک میں یکساں طور پر نہیں ہوتا، لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک شخص کے لئے جو چیز سچائی ہے، ممکن ہے دُوسرے کے لئے وہ سچائی نہ ہو، اس لئے اس سلسلے میں تجربے کرنے والے افراد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِن تجربوں میں کچھ شرائط کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

اس وقت چونکہ ہر شخص کسی قسم کے ضبط اور پابندی کے بغیر ضمیر کی آزادی کے حق کا مدعی ہے اس لئے ایک حیران اور ششدر دُنیا کے سامنے بہت کچھ پیش کیا جا رہا ہے جو سچ نہیں ہے۔ پوری انکساری کے ساتھ میں آپ سے یہی کہہ سکتا ہوں

کہ جس شخص میں عجز و انکساری بدرجہ اتم موجود نہیں وہ سچائی کو نہیں پا سکتا اور اگر آپ سچائی کی تہہ تک پہونچنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی ہستی کو بالکل ختم کر دینا ہوگا۔

جہاں سچائی ہے وہاں گیان بھی ہے جو کہ سچائی ہے۔ جہاں سچائی نہیں ہوتی وہاں سچا علم نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے لفظ 'چیت' یا علم کو خدا کے نام سے وابستہ کیا گیا ہے اور ان سچا علم ہوتا ہے وہاں آنند، یعنی انتہائی مسرت ہوتی ہے۔ وہاں غم کے لئے کوئی جگہ ہیں ہوتی۔ اور جس طرح سچائی ہمیشہ رہنے والی ہے اسی طرح ہم خدا کو 'ست چیت آنند' کی صورت میں پہچانتے ہیں یعنی وہ جس میں سچائی، علم اور انتہائی مسرت موجود ہیں۔

سچائی میں سے محبت، رحمدلی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ سچائی کے داعی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو خاک کی طرح حقیر سمجھے۔ وہ جتنا زیادہ حقیقت کا پابند ہوتا جاتا ہے، اس میں عجز و انکساری کا جذبہ اسی حد تک بڑھتا جاتا ہے۔ یہ بات مجھے زندگی میں ہر لمحہ دکھائی دیتی ہے۔ مجھے آج ایک سال پہلے کی نسبت سچائی اور اپنے چھوٹے پن کا کہیں زیادہ احساس ہے۔ 'برہما ستیم اگن متھیا' (برہما حقیقت ہے اور سب کچھ غیر حقیقی ہے) کا مطلب مجھے روز بروز زیادہ سے زیادہ سمجھ میں آ رہا ہے۔ اس سے ہمیں صبر کا سبق ملتا ہے۔ یہ جذبہ ہمارے اندر کی تلخی کو ختم کرے گا اور ہم میں برداشت کا مادہ بڑھائے گا۔ اس کی بدولت ہمیں اپنی غلطیاں رائی کا پہاڑ اور دوسروں کی غلطیاں پہاڑ کے بجائے رائی نظر آئیں گی۔ انا یا خودی کے موجود ہونے کی وجہ سے ہمارا وجود قائم ہے۔ جسم یا انا کا فنا ہو جانا موکش (نجات) ہے۔ جس کو یہ بات نصیب ہوگی وہ سچائی کا مظہر بن جاتا ہے، اُسے ہم برہمن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی لئے خدا کو پیار سے "داسا نو داسا" (خادموں کا خادم) کہا گیا ہے۔ بیوی، بچے، دوست اور دُنیاوی املاک سب کو سچائی سے کمتر درجہ حاصل ہونا چاہیئے۔ ان میں سے ہر ایک چیز کو سچائی کے لئے قربان کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ سچّائی اور اہنسا

اہنسا اور سچائی ایک دوسرے سے ایسے ملے جُلے ہوئے ہیں کہ اُنہیں عملی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ یا دھات کی ایک ایسی گولائی کے مانند ہیں جو دونوں طرف سے سادہ ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ کون سا رُخ سیدھا اور کون سا رُخ اُلٹا ہے؛ تاہم اہنسا ذریعہ ہے اور سچّائی مقصد ہے۔ ذریعہ ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے جو ہماری دسترس میں ہو۔ اس لئے اہنسا ہمارا اعلیٰ ترین فرض ہے۔ اگر ذرائع کو ہم صحیح طریقے پر اپنائیں تو ہم جلد یا بدیر اپنے مقصد کو پا ہی لیں گے۔

ایک بار ہم اس نکتے کو سمجھ لیں تو ہماری جیت یقینی ہے۔ ہمیں کتنی ہی مشکلات پیش آئیں اور ظاہرا طور پر ہمیں کتنی بار ہی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑے، ہمیں سچّائی کی تلاش ترک نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ سچّائی ہی خدا ہے۔

اہنسا منزل نہیں ہے۔ منزل سچائی ہے۔ لیکن انسانی تعلقات میں سچائی کا حصول صرف اہنسا پر عمل کر کے ہی ممکن ہے۔ مستقل مزاجی سے اہنسا کی پیروی کر کے ہی ہم سچّائی کی منزل پا سکتے ہیں۔ اسی لئے میں اہنسا پر اتنا زور دیتا ہوں۔ سچّائی قدرتی طور پر مجھے حاصل ہوئی مگر اہنسا کے حصول کے لئے مجھے جدوجہد کرنا پڑی۔

چونکہ اہنسا ایک ذریعہ ہے اس لئے ہمیں روزمرّہ کی زندگی میں قدرتی طور پر اس سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اسی لئے لوگوں کو اہنسا کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے اُنھیں سچّائی کی تعلیم قدرتی طور پر حاصل ہو جائے گی۔

اہنسا میرا خدا ہے اور سچّائی بھی۔ جب میں اہنسا کی تلاش کرتا ہوں تو سچّائی کہتی ہے "اسے میرے ذریعے تلاش کرو"۔ اور جب میں سچّائی کی تلاش کرتا ہوں تو اہنسا کہتی ہے "اسے میرے واسطے سے ڈھونڈھو"۔

میرے پاس دُنیا کے سکھانے کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سچّائی اور اہنسا زمانہ قدیم سے ہی موجود ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ جتنے وسیع پیمانے پر ممکن تھا، میں نے ان دونوں کا تجربہ کیا ہے۔ ایسا کرنے میں میں نے کبھی کبھی غلطی بھی کی ہے اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھا ہے۔ اس طرح زندگی اور اس کے مسائل میرے لئے سچّائی اور اہنسا کے تجربے بن گئے ہیں۔

جبلّی طور پر میں سچّائی کا پابند رہا ہوں لیکن اہنسا کا نہیں۔ ایک جین منی نے بالکل ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں اہنسا کا اس قدر پرجوش پیرو نہیں تھا جس قدر کہ سچّائی کا۔ اور اس میں موخرالذکر کو پہلی اور اوّل الذکر کو دوسری جگہ دیتا ہوں۔ جیسا کہ اُنھوں نے کہا ہے۔ میں بھی اہنسا کو سچّائی کے لئے قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سچّائی کی تلاش کے دوران میں نے اہنسا کو دریافت کیا۔

میں پچاس سال سے زیادہ عرصے سے سائنسی باریک بینی سے اہنسا کا تجربہ کر رہا ہوں۔ میں نے اس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے (گھریلو، معاشی یا سیاسی اور ادارہ جاتی) پر کیا ہے۔ مجھے ایک بھی ایسے واقعہ کا علم نہیں جس میں یہ تجربہ ناکامیاب رہا ہو۔ بعض اوقات جب کبھی یہ تجربہ مجھے ناکامیاب ہوتا نظر آیا ہے اُسے میں نے اپنی خامی

سے منسوب کیا ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھ میں کمیاں یا خامیاں نہیں ہیں۔ سچائی کی تلاش کی لگن کا دعویٰ ضرور کرتا ہوں اور سچائی خدا کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس تلاش کے دوران میں ہی میں نے اہنسا کا پتہ پایا۔ اُسے پھیلانا میری زندگی کا مشن ہے اس مشن کی تکمیل کے سوا اور کسی مقصد کے لئے زندہ رہنے میں مجھے دلچسپی نہیں۔

میں نے ہندوستان کے سامنے ایثار کا قدیم طریقہ پیش کیا ہے۔ کیوں کہ ستیہ گرہ اور اس سے پیدا شدہ دُوسری شکلیں جیسے عدم تعاون اور سول مزاحمت دکھ اور تکلیف جھیلنے کی نئی صورتیں ہیں۔

جن رشیوں نے تشدّد کے درمیان عدم تشدّد کا طریقہ دریافت کیا تھا وہ نیوٹن سے بھی بڑے جینیس تھے۔ وہ ولنگٹن سے بھی بڑے سورما تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہتھیار بالکل بے کار ہیں اور اُن کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی لئے اُنھوں نے تھکی ماندی دُنیا کو یہ بتایا کہ اس کی نجات تشدّد نہیں عدم تشدّد میں ہے۔

اہنسا اپنی حرکی صورت میں ارادتاً دکھ اور تکلیف اُٹھانے کے مترادف ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بُرا کام کرنے والے کے سامنے بزدلی سے جُھک جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی تمام تر روحانی طاقت کے ساتھ جابر کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس طریقۂ کار پر عمل کر کے کسی ایک شخص کے لیے اپنی عزّت، مذہب اور آتما کے تحفظ کے لئے کسی بے انصاف سلطنت کی قوت سے ٹکر لینا ممکن ہے اور ایسی سلطنت کے خاتمے، زوال کا آغاز ہو سکتا ہے۔

میں ہندوستان سے عدم تشدّد پر عمل کرنے کی اپیل اس لئے نہیں کر رہا ہوں۔ کہ ہندوستان کمزور ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان اپنی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے بھی عدم تشدّد کی راہ پہ چلے۔ اپنی طاقت کو محسوس کرنے کے لیے اُسے کسی قسم

ے ہتھیاروں کی تربیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ہتھیاروں کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کیوں کہ ہم اپنے آپ کو محض گوشت کا لوتھڑا سمجھتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ ہندوستان اس بات کو پہچانے کہ اُس کی بھی روح ہے جو کبھی تباہ نہیں ہو سکتی اور جو تمام جسمانی کمزوریوں کے باوجود تمام دُنیا کی جسمانی طاقت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

اگر ہم قدیم زمانے سے موجودہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انسان نے بتدریج اہنسا کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آباد اجداد آدم خور تھے۔ اُس کے بعد وہ آدم خوری سے تنگ آگئے اور انھوں نے شکار پر گذر بسر شروع کیا۔ پھر ایک منزل وہ آئی کہ انسان کو ایک خانہ بدوش شکاری کی سی زندگی بسر کرنے میں ندامت محسوس ہونے لگی اور اُس نے کھیتی باڑی شروع کر دی اور اپنی خوراک کے لئے زیادہ تر زمین کی پیداوار پر انحصار کرنے لگا۔ اس طرح خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے اُس نے ایک جگہ آباد ہو کر مہذب زندگی شروع کی۔ گاؤں اور قصبے آباد کئے اور محض ایک کنبے کا رُکن ہونے کی بجائے وہ ایک فرقے اور پھر ایک قوم کا فرد بھی بن گیا۔ یہ تمام باتیں اہنسا کی ترقی اور ہنسا کی کمی کی علامتیں تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک نسلِ انسانی بھی نیچے درجے کی کئی نسلوں کی طرح ختم ہو گئی ہوتی۔

پیغمبروں اور اوتاروں نے بھی اہنسا کا سبق ہی دیا ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی ہنسا کا درس دینے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور اس کے برعکس ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ ہنسا کے درس دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ انسان بطور ایک حیوان تشدد کرنے

کا رُجحان رکھتا ہے لیکن چونکہ رُوح عدم تشدّد کی قائل ہے، اس لئے انسان کے لئے تشدّد کی راہ پر ہی چلتے رہنا ممکن نہیں۔ اُسے یا تو اہنسا کی طرف قدم بڑھانا ہوگا یا اپنی تباہی کی طرف۔ اسی لئے پیغمبروں اور اوتاروں نے سچائی، یکانگت، بھائی چارے، انصاف وغیرہ کا درس دیا ہے اور یہ تمام اوصاف اہنسا کے لوازم ہیں۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ اب بھی اگرچہ سماجی ڈھانچہ عدم تشدّد کے اصول پر مبنی نہیں ہے۔ تاہم تمام دُنیا میں انسان نے جو جو اشیاء اپنے قبضے میں کر رکھی ہیں اور انسان جو زندہ ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں لوگوں کی مرضی بھی شامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چند ایک طاقتور جنگجو افراد ہی زندہ نظر آتے۔ لیکن اصلیت یہ نہیں ہے کنبوں کے افراد محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ تمام گروپ جنہیں مہذّب سماج میں قومیں کہا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ظاہرا طور پر عدم تشدّد کے اصول کی فوقیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنہوں نے اُس کے وسیع امکانات کا جائزہ نہیں لیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک محض بے حسی کی وجہ سے ہم اس بات کو مانتے رہے ہیں کہ مکمّل عدم تشدّد پر عمل کرنا صرف اُن چند افراد کے لیے ہی ممکن ہے جو بالکل تارک الدّنیا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو لوگ اس اصول کے داعی اور پیروکار ہیں وہی اس سلسلے میں تحقیقی کام کر سکتے ہیں اور یہ بتا سکتے ہیں کہ انسانوں پر اثر انداز ہونے والے اس عظیم ابدی قانون کے نئے امکانات کیا ہیں۔ لیکن اگر یہ قانون ہے تو سب پر یکساں طور سے اس کا اطلاق ہونا چاہیئے ہمیں اس سلسلے میں جو کامیابیاں دکھائی دیتی ہیں وہ اس قانون کی نہیں ہیں بلکہ اس پر عمل کرنے والوں کی ہیں۔ اور اُن میں سے کئی افراد کو تو اس امر کا احساس تک نہیں ہوتا کہ انھوں نے اس ضابطے کو دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ جب ایک ماں اپنے بچّے کے لیے جان دے دیتی ہے تو انجانے طور پر اس قانون کی پابندی کرتی ہے۔ میں پچھلے پچاس برسوں سے اس کی اپیل کر رہا ہوں

کہ عدم تشدد کے ضابطے کو ارادتاً قبول کیا جائے اور ناکامیوں کے باوجود اُس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ پچاس سال کے کام سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں اور میرا عقیدہ مضبوط ہوا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ مسلسل عمل کے ذریعے ایسی حالت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ کسی چیز پر کسی شخص کے قانونی قبضے کو دُنیا بھر میں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ بلاشبہ ایسا قبضہ ہر قسم کے داغ سے پاک ہونا چاہیے اور اس سے غیر مساوات، جو ہمارے آس پاس موجود ہے، کا بھدّا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ عدم تشدد کے پیرو کاروں کو غیر قانونی اور غیر منصفانہ قبضے کے مسئلے سے بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ عدم تشدد کے ہتھیار ستیہ گرہ اور عدم تعاون اُن کے پاس موجود ہیں۔ جب بھی وہ ہتھیاروں کا دیانتداری سے اور مناسب حد تک استعمال کریں گے اُنھیں تشدد کا متبادل پائیں گے۔ میں نے عدم تشدد کی تمام جزئیات اور تفصیلات کو پیش کرنے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور ایسا کرنا ممکن نہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے کسی بھی طبیعیاتی سائنس، یہاں تک کہ ریاضی ایسی قطعی سائنس کی صورت میں بھی، بالکل قطعی ہونا ممکن نہیں۔ میں تو محض ایک کھوجی ہوں۔

اس زمانے میں جبکہ بڑی عجیب باتیں ہو رہی ہیں، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی چیز یا کوئی خیال محض نیا ہونے کے باعث بیکار ہے۔ کسی مشکل کام کو ناممکن ظاہر کرنا بھی اس زمانے کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ہر روز ہم ایسی چیزیں دیکھ رہے ہیں جو کبھی ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ جن باتوں کو ناممکن سمجھا جاتا تھا، وہ اب ممکن ہو رہی ہیں۔ ہم ان دنوں تشدد کے میدان میں کی جانے والی دریافتوں پر مسلسل حیران ہو رہے ہیں۔ لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ عدم تشدد کے میدان میں اس سے

بھی زیادہ حیران کن دریافتیں دیکھنے میں آئیں گی جو اس وقت ہمیں ناممکن العمل نظر آتی ہیں۔

عدمِ تشدد کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بدی کے خلاف لڑائی سے دستبردار ہو جائیں۔ اس کے برعکس میرے ذہن میں عدمِ تشدد کا جو تصور ہے وہ زیادہ حرکی ہے اور یہ بدی کے خلاف انتقامی کارروائی کے مقابلے میں اصل جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ انتقامی کارروائی سے تو بدی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں غیر اخلاقی فعل کی مزاحمت اخلاق سے کرنے کا تصور ہے۔ میں ظالم کی تلوار کو بالکل کُند کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے خلاف کوئی زیادہ تیز دھار والا ہتھیار اُٹھا کر نہیں بلکہ اس کی اس توقع کو پورا نہ کر کے کہ میں اس کے خلاف جسمانی مزاحمت پیش کروں۔ روحانی مزاحمت اس کو چکر میں ڈال دے گی۔ شروع میں تو وہ کچھ پریشان ہی ہوگا لیکن بالآخر وہ اس کی طاقت کو تسلیم کرے گا جس سے وہ ذلت محسوس نہیں کرے گا بلکہ اُلٹا اُسے اس بات کا احساس ہوگا کہ وہ پہلے سے بلند سطح پر کھڑا ہے یہ یقیناً ایک مثالی حالت ہوگی۔

عدمِ تشدد بلند ترین سطح کی ایک سرگرم قوت ہے۔ یہ ہمارے اندر بسنے والے خدا کی طاقت ہے۔ نامکمل انسان اس کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے اور نہ ہی وہ اس قوت کی پوری تاب لا سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس قوت کا معمولی سے معمولی حصہ بھی ہمارے اندر متحرک ہو جائے تو یہ معجزے دکھا سکتی ہے۔

ہمارے اندر خدا کی موجودگی کا احساس، بلاشبہ، اس ضمن میں سب سے پہلی ضروری شرط ہے۔

اگر کسی شخص میں گھمنڈ اور خود پرستی کا جذبہ ہو تو وہاں عدمِ تشدد کا کوئی کام نہیں۔ عدمِ تشدد کا وہاں کوئی کام نہیں جہاں عجز و انکساری کا جذبہ موجود نہ ہو۔

جب میں اپنے آپ کو صفر کے برابر سمجھنے کے قابل ہوا تبھی میں افریقہ میں ستیہ گرہ کی طاقت کے خیال کو کوئی شکل دینے کے اہل ہوا۔

عدم تشدد کے لئے کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی تربیت کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے محض اس ارادے کی ضرورت ہے کہ ہم جوابی کارروائی کے طور پر بھی کسی کی جان نہیں لیں گے اور اتنی جرات ہونی چاہیئے کہ کسی بدلے کے بغیر موت کا سامنا کر سکیں۔ یہ باتیں اہنسا کے موضوع پر پند و نصیحت نہیں ہیں بلکہ محض عقلی دلیلیں اور آفاقی ضابطے کا اظہار ہیں۔ اگر اس ضابطے میں پورے اعتماد اور اتفاق کے ساتھ بھروسہ کریں تو کسی بھی اشتعال انگیزی کے مقابلے میں اپنی قوت برداشت کم تر ثابت نہ ہوگی۔ اس کو میں بہادروں کا عدم تشدد کہتا ہوں۔

محبت کوئی مطالبہ نہیں کرتی۔ وہ تو محض کچھ دیتی ہی ہے۔ محبت ہمیشہ مصیبت برداشت کرتی ہے اور کبھی ناراضی کا اظہار نہیں کرتی اور کبھی انتقام نہیں لیتی۔

جہاں محبت ہے وہاں زندگی ہے۔ نفرت ہمیں تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

محبت دُنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے مگر اُس کے باوجود اس میں بڑی انکساری ہے۔

میرے پاس دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لیے محبت کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔

میں تخیل پرست نہیں ہوں۔ میں باعمل تخیل پرست ہوں۔ عدم تشدد کا عقیدہ محض رشیوں اور سنتوں کے لیے ہی نہیں عام لوگوں کے لیے بھی ہے۔ عدم تشدد ہمارے لیے ایسا ہی ضابطۂ عمل ہے جیسا کہ تشدد وحشیوں اور حیوانوں کے لیے ایک

جابر شخص کی رُوح خوابیدہ ہوتی ہے اور اُسے جسمانی طاقت کے سوا اور کسی قانون کا علم نہیں ہوتا۔ انسانی وقار اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ تر قانون یعنی روحانی قوت کے تابع ہو جائے۔

آج کل یہ کہنا ایک فیشن بن گیا ہے کہ سماج کی تنظیم عدم تشدد پر ممکن ہی نہیں مجھے اس بات سے اختلاف ہے۔ خاندان میں جب باپ غلط راہ پر چلنے والے لڑکے کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے تو وہ لڑکا باپ کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کی بات نہیں سوچتا۔ وہ اپنے باپ کا حکم اس مار کے اثر کے تحت نہیں مانتا بلکہ اس لئے مانتا ہے کہ اس کے پس پردہ باپ کی شفقت کام کر رہی ہوتی ہے۔ میری رائے میں یہ اس بات کا لب لباب ہے، جس پر سماج کا نظام چلتا ہے یا چلنا چاہئے۔ جو بات ایک کنبے کے بارے میں درست ہے، وہ سماج کے بارے میں بھی جو ایک بڑا کنبہ ہے، درست ہونی چاہئے۔

میرا عدم تشدد کا اصول ایک سرگرم طاقت ہے۔ اُس میں بزدلی اور کمزوری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تشدد پر چلنے والے کسی شخص کے بارے میں تو یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی عدم تشدد کی راہ اختیار کرے گا، لیکن ایک بزدل شخص کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے میں نے کئی بار یہ کہا ہے کہ اگر ہم اپنا، اپنی عورتوں کا اور اپنی عبادت گاہوں کا بچاؤ عدم تشدد کے ذریعے نہیں کر سکتے تو اگر ہم انسان ہیں تو ہمیں کم از کم لڑ کر ان چیزوں کی حفاظت کرنے کے قابل ضرور ہونا چاہئے۔

میں ایک بزدل شخص کو عدم تشدد کا درس نہیں دے سکتا جس طرح کہ میں ایک اندھے کو قدرتی مناظر سے لطف اُٹھانے کو نہیں کہہ سکتا۔ عدم تشدد تو بہادری کی

پہنچتا ہے۔

اگر ہم عدم تشدد پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس دُنیا میں کسی ایسی چیز کی خواہش نہیں کرنی چاہیے جو ایک ادنیٰ ترین انسان کو بھی میسر نہیں آسکتی۔

اگر کوئی شخص دوسروں کے ساتھ ذاتی تعلقات میں عدم تشدد کا پابند نہیں رہ سکتا اور بڑے معاملات میں اس پر عمل کرنے کی اُمید رکھتا ہے، تو یہ اُس کی بڑی بھول ہے، خیرات کی طرح عدم تشدد کا آغاز بھی گھر سے ہونا چاہیے۔

اگر آپ کے پاس کردار کا سرمایہ نہیں ہے تو ستیہ گرہ کی جدوجہد میں آپ کی شرکت ناممکن ہے۔

حکم عدولی کو اگر مہذبانہ دائرے کے اندر رکھنا ہے تو اُس کا اخلاص، احترام اور ضبط پر مبنی ہونا لازمی ہے۔ اس میں تلون مزاجی اور کسی کے خلاف نفرت کا جذبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اُس کی بُنیاد کچھ سوچے سمجھے اصولوں پر ہونی چاہیئے۔

ستیہ گرہ کے ابتدائی دور میں میں نے یہ دریافت کیا کہ سچائی کی تلاش کے راستے میں مخالف پر تشدد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ مخالف کو صبر اور ہمدردی کے ساتھ غلط راستے سے ہٹانے کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے نزدیک جو چیز سچائی ہے وہ دوسرے کی نظر میں ایک غلطی ہو۔ اور صبر سے مراد خود دُکھ برداشت کرنا ہے، اس لئے اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ مخالف کو دُکھ دے کر نہیں بلکہ خود دُکھ اُٹھا کر سچائی کو ثابت کیا جائے۔

ستیہ اور اہنسا، دونوں کی مدد سے آپ دُنیا کو اپنے قدموں میں جھکا سکتے ہیں۔ ستیہ گرہ کا نچوڑ اس کے سوا کچھ نہیں کہ سیاسی و قومی زندگی میں سچائی اور شرافت

کو داخل کیا جائے۔

اُصولاً عدم تشدد کے ذریعے طاقت پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی یہ اس کا منتہائے مقصود ہو سکتا ہے، لیکن عدم تشدد کے ذریعے اُس سے زیادہ بڑا کام سر انجام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی حکومت کی مشینری پر قبضہ کئے بغیر طاقت پر مؤثر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ یہی اس کی خوبی ہے۔

غلطی کرنے والے کو پریشان کرنا ستیہ گرہی کا ارادہ کبھی نہیں ہوتا۔ ہمیشہ غلطی کرنے والے کے دل تک پہونچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُسے خوفزدہ کرنے کا ہرگز مقصد نہیں ہوتا۔ ستیہ گرہی کا مقصد غلطی کرنے والے کو مجبور کرنا نہیں بلکہ اس کے دل میں تبدیلی لانا ہوتا ہے۔ اسے اپنے تمام کاموں میں تصنع سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ وہ اندرونی اعتقاد سے متحرک ہو کر کام کرتا ہے اور اس کا ہر عمل قدرتی معلوم ہوتا ہے۔

ایک ستیہ گرہی کو برائی اور بُرائی کرنے والے کے درمیان فرق کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے۔ ستیہ گرہی کو برائی کرنے والے کی ذات کے خلاف کوئی تلخی دل میں نہیں رکھنی چاہیئے۔ ایک ستیہ گرہی ہمیشہ بدی پر نیکی سے، غصے پر محبت سے، جھوٹ پر سچائی سے اور ہنسا پر اہنسا سے غالب آنے کی کوشش کرے گا۔ دُنیا کو بدی سے نجات دلانے کا اور کوئی راستہ نہیں۔

چونکہ ستیہ گرہ راست اقدام کا ایک نہایت زبردست طریقہ ہے، اس لئے ایک ستیہ گرہی، ستیہ گرہ کرنے سے پہلے دُوسرے تمام طریقوں کو آزمالیتا ہے۔ وہ سرکاری حکام سے رجُوع کرے گا، رائے عامہ سے اپیل کرے گا۔ لوگوں کے سامنے اپنے خیالات پیش کرے گا، ہر ایک کو جو بھی اس کی بات سننا چاہے اپنی بات ٹھنڈے

دل سے سمجھانے کی کوشش کرے گا، اور ان تمام طریقوں کی ناکامیابی کے بعد ہی وہ ستیہ گرہ کا حربہ استعمال میں لائے گا۔ لیکن جب وہ اندرونی آواز کے کہنے پر ستیہ گرہ شروع کر دے تو پھر اس کے لیے پیچھے ہٹنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ایک ستیہ گرہی حکام کو پریشان کرنے کی نیت سے جیل نہیں جاتا بلکہ اس کا ارادہ ان کے سامنے اپنی معصومیت کا مظاہرہ کر کے اُن کے دل میں تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ستیہ گرہ کا اصول اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ جب تک آپ اخلاقی لحاظ سے جیل جانے کے اہل نہیں ہو جاتے۔ آپ کا جیل جانا بے کار ثابت ہوگا اور بالآخر اس کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ایک ستیہ گرہی کبھی ڈرتا نہیں۔ وہ مخالف پر اعتماد کرنے سے بھی کبھی نہیں گھبراتا۔ اگر مخالف اس کو بیس بار بھی دھوکہ دے، تو ستیہ گرہی اس پر اکیسویں بار اعتبار کرنے کو تیار ہو جائے گا کیونکہ انسانی فطرت پر واضح طور پر اعتماد رکھنا اس کے اصول کا نچوڑ ہے،

کئی لوگوں نے شک و شبے کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عوام کو عدم تشدد کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ یہ افراد کے لیے بھی ممکن ہے اور وہ بھی بہت کم حالتوں میں۔ میرے خیال میں ایسا کہنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ اگر انسان میں فطرتاً عدم تشدد کا جذبہ موجود نہ ہوتا تو انسانی نسل کب کی ختم ہو گئی ہوتی۔ لیکن عدم تشدد اور تشدد کی طاقتوں کے درمیان لڑائی میں، اوّل الذکر کی آخرکار ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم میں صبر کا اتنا مادہ نہیں کہ ہم سچے دل سے لوگوں میں سیاسی مقاصد کے لیے عدم تشدد کے استعمال کی ضرورت کا پرچار کرتے جائیں۔

سوال: آپ یہ کیسے سمجھتے ہیں کہ ہم عدم تشدد پر عمل کر سکتے ہیں جبکہ ہم یہ جانتے ہیں

کہ اُن میں غصے، نفرت اور کدورت کے جذبات جلد اُبھر آتے ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ پڑتے ہیں۔

جواب:۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان باتوں کے باوجود وہ مشترکہ بہبود کے لئے عدم تشدد پر عمل کر سکتے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہزاروں عورتوں کے دل میں جنہوں نے قانون کی خلاف ورزی کر کے نمک اکٹھا کیا تھا، کسی کے خلاف بغض تھا؟ وہ یہ جانتی تھیں کہ کانگرس نے یا گاندھی نے انھیں کچھ کام کرنے کو کہا ہے اور انہوں نے وہ کام وشواس سے اور یہ توقع رکھتے ہوئے کر دیا کہ اس کا اچھا نتیجہ برآمد ہوگا۔ میرے خیال میں عدم تشدد کا مکمل مظاہرہ چمپارن میں ہوا۔ کیا وہ ہزاروں مزارعے جو کھیتی باڑی میں پائی جانے والی خرابیوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے، حکومت یا زمینداروں کے خلاف کوئی بغض رکھتے تھے؟ عدم تشدد میں ان کا اعتقاد بنا سوچے سمجھے تھا۔ جیسا کہ ہم اس بات پر یقین کر لیتے ہیں کہ زمین گول ہے۔ لیکن اپنے رہنماؤں پر ان کا اعتماد حقیقی تھا، اور یہی بات کافی تھی۔ قیادت کرنے والوں کی بات بالکل الگ ہے۔ اُن کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن کا عقیدہ سوچ سمجھ پر مبنی ہو کیونکہ اُنھیں اپنے عقیدے سے پیدا ہونے والے تمام نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ہم لوگوں کو انفرادی طور پر یا مجموعی طور پر اس مشکل کام کی تربیت کس طرح دے سکتے ہیں؟ اس کے لئے کوئی آسان راستہ موجود نہیں۔ اس کا طریقہ اپنی زندگی میں اس اُصول پر عمل کرنا ہے اور یہی اس چیز کا جاندار پرچار ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ کسی فرد کے لئے اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے وسیع مطالعہ، زبردست مستقل مزاجی اور اپنی ذات کو تمام گندے خیالوں سے پاک کرنا لازمی شرائط ہیں۔ اگر طبیعاتی سائنسوں پر عبور حاصل کرنے کے لئے آپ کو تمام عمر صرف کرنا پڑتی ہے تو اس سے بڑی روحانی

قوت کو حاصل کرنے کے لئے کتنے جنم لینے کی ضرورت ہوگی؟ اور اگر اس مقصد کے لئے کئی جنم بھی صرف کرنے پڑیں تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے کیوں کہ زندگی میں یہی ایک حقیقی چیز ہے، اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس کی قیمت ہے تو اُسے حاصل کرنے کے لیے کتنی ہی کوشش کرنی پڑے، اُسے رائیگاں نہیں سمجھنا چاہیئے۔ آپ کو پہلے غیر معمولی رُوحانی طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور باقی ہر چیز آپ کو مل جائے گی۔ غیر معمولی روحانی طاقت ہی اہنسا ہے۔

سوال:۔ اگر یہ ہم تسلیم کرلیں کہ عوامی انقلاب کے ذریعے ہی آزادی حاصل کرنا ممکن ہے تو کیا آپ کے خیال میں یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس انقلاب کے دوران میں عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی کے باوجود خیال و عمل میں بالکل عدم تشدد سے کام لیں گے؟ فردِ واحد کے لئے تو اس معیار تک پہنچنا ممکن ہے لیکن کیا آپ کے خیال میں عام لوگوں کے لئے بھی عدم تشدد کے اس معیار تک پہنچنا ممکن ہوگا

جواب:۔ اس موقع پر یہ ایک عجیب سوال معلوم ہوتا ہے کیوں کہ عدم تشدد پر مبنی ہماری لڑائی کے تمام واقعات اس بات کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں کہ جہاں کہیں بھی تشدد کے واقعات ہوئے ہیں، ان کا آغاز عام لوگوں کی طرف سے نہیں کیا گیا بلکہ اُسے کچھ طبقوں کے افراد نے شروع کیا جو اپنے آپ کو پڑھا لکھا دانشور مانتے ہیں۔ تشدد کی لڑائی میں اگرچہ انفرادی طور پر کوئی شخص جوش میں قابو سے باہر ہو کر سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن لڑنے والی فوج مجموعی طور پر ایسا نہیں کرتی۔ وہ ہتھیار بھی اُٹھاتی ہے جب اُسے ایسا کرنے کا حکم ملتا ہے تو اور حکم ملنے پر اُسے لڑائی بند کرنی پڑتی ہے، خواہ انتقام لینے کا جذبہ انفرادی سطح پر بے حد شدید ہی ہو۔ بادی النظر میں اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ عدم تشدد پر مبنی

لڑائی میں اگر عوام نظم وضبط کے پابند ہوں تو وہ لڑائی میں مسلح فوج کی مانند ضابطے کے پابند کیوں نہیں رہ سکیں گے۔ اس کے علاوہ عدم تشدد کی لڑائی کے جرنیل کو ایک فائدہ یہ رہتا ہے کہ اُسے لڑائی کو کامیابی سے جاری رکھنے کے لئے ہزاروں لیڈروں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ عدم تشدد کا پیغام پہنچانے کے لئے اُسے آدمیوں کی ضرورت نہیں بلکہ کچھ سچے افراد کی مثال ہی لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہے بشرطیکہ انھوں نے عدم تشدد کی سپرٹ کو اچھی طرح قبول کیا ہو۔ تحریک کے آغاز میں مجھے ایسا ہی تجربہ ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ لوگوں کا دراصل یہ خیال تھا کہ میں عدم تشدد کا پرچار کرنے کے باوجود دل ہی دل میں تشدد کا حامی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو رہنماؤں کے بیانات سے اسی طرح معنی اخذ کرنے کی تربیت ملی تھی۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی میرے دل میں ہے تو انھوں نے نہایت اشتعال انگیز حالات کے تحت بھی عدم تشدد پر عمل کیا۔ چوری چورا کے واقعہ کو دُہرایا نہیں گیا۔ جہاں تک خیالات میں عدم تشدد پر کاربند رہنے کا تعلق ہے، اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ عمل میں عدم تشدد کی پابندی نہ کی جائے۔

میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ تشدد پر کوئی پائدار عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔

وحشیانہ پن کا جواب وحشیانہ پن سے دینا اپنے اخلاقی و ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت دینے کے مترادف ہے اور اس سے بدی کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

اگرچہ تشدد کرنا جائز نہیں، تاہم جب اپنی حفاظت کے لئے یا کسی بےکس کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ ایک بہادری کا کارنامہ ہوگا۔ جو بزدلی سے سر جھکا دینے کے فعل کی بہ نسبت کہیں بہتر ہوگا۔ موخرالذکر فعل نہ مردوں کو زیب

دیتا ہے اور نہ عورتوں کو۔

میں کسی شخص کے بزدل بن جانے کے مقابلے میں اس کی طرف سے تشدد کے استعمال کے خطرے کو ہزار بار ترجیح دوں گا

میرا یہ اعتقاد ہے کہ جب انتخاب بزدلی اور تشدد کے درمیان ہو تو میں تشدد کی تلقین کروں گا۔

میرے خیال میں ہندوستان کے لیے بزدلی سے خاموش تماشائی کی طرح بے عزتی برداشت کرنے کی بجائے یہی بہتر ہوگا کہ وہ اپنی عزت کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھائے۔

تشدد پر مجھے اس لیے اعتراض ہے کہ بظاہر اس کا فائدہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن یہ فائدہ بالکل عارضی ہوتا ہے اور اس سے جو برائی پیدا ہوتی ہے وہ مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔

لیکن میرا یہ اعتقاد ہے کہ عدم تشدد کو تشدد پر فوقیت حاصل ہے۔ معاف کر دینا سزا دینے کی نسبت زیادہ بہادرانہ فعل ہے۔ معاف کرنے کی خصلت ایک سپاہی کا گہنا ہے لیکن ہاتھ نہ اٹھانا اسی وقت معاف کر دینے کے مترادف ہے جب کہ معاف کرنے والے کے پاس سزا دینے کی طاقت بھی ہو جب اس کے پس پردہ بے بسی ہو تو یہ ایک بے معنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔

لیکن میں ہندوستان کو بے بس تسلیم نہیں کرتا میں اپنے آپ کو بے بس انسان تصور نہیں کرتا۔ طاقت سے مراد جسمانی طاقت سے نہیں۔ طاقت غیر متزلزل قوت ارادی سے حاصل ہوتی ہے۔

غصّے اور کینے کے بغیر دُکھ اُٹھانے کے عمل سے روشن آفتاب کے سامنے انتہائی سنگدلی اور جہالت کی تاریکی دُور ہو جاتی ہے۔

اگر لالچ نہ ہو تو اسلحہ کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ عدم تشدّد کے اصول کا مطلب یہ ہے کہ لوٹ کھسوٹ سے ہر حالت میں پرہیز کیا جائے

ایک بات یقینی ہے۔ اگر اسلحہ کے لئے پاگل پن کی دوڑ اسی طرح جاری رہی تو اس کا نتیجہ ایک ایسے قتلِ عام کی صورت میں رُونما ہوگا جو آج تک کبھی نہیں ہوا۔ اگر اس جنگ میں کوئی فاتح زندہ بھی بچ گیا تو یہ فتح ہی فاتح قوم کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوگی۔ اس قسم کی تباہی سے بچنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ عدم تشدد کے طریقِ کار کو اس کے تمام شاندار نتائج کے ساتھ، غیر مشروط طور پر اور دلیری سے قبول کر لیا جائے۔

مجھے اس امر میں رتی بھر شک نہیں کہ کل کی دُنیا کے سماج کی بنیادیں عدم تشدد پر رکھی جانی چاہئیں۔

۳- اعتقادات و اقدار

میں یہ نہیں کہتا کہ میرے اندر کوئی خاص خدائی طاقت ہے۔ نہ ہی میں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں تو سچائی کا ایک ادنیٰ کھوجی ہوں اور اس کی تلاش میں جی جان سے لگا ہوں۔ میرے نزدیک خدا کو روبرو دیکھنے کے لئے کوئی بھی قربانی زیادہ نہیں۔ میرے تمام کام خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اخلاقی ہوں یا خدمتِ انسانی سے متعلق ان کا مقصد یہی ہے اور چونکہ میں جانتا ہوں کہ خدا اونچے اور طاقت ور طبقے کے افراد کی بجائے زیادہ تر اپنی کمترین مخلوقات میں ملتا ہے اس لئے میں ان ہی لوگوں کے درجے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ کام میں ان لوگوں کی خدمت کے ذریعے ہی سرانجام دے سکتا ہوں۔ اسی لئے میں دبے ہوئے طبقے کے افراد کی خدمت کرنے کی زبردست خواہش رکھتا ہوں لیکن چونکہ یہ خدمت میں سیاست میں قدم رکھے بغیر نہیں انجام دے سکتا اس لئے میں سیاست میں حصہ لے رہا ہوں۔ اس طرح میں کوئی آقا نہیں ہوں بلکہ ہندوستان اور اس کے توسط سے بنی نوع انسان کا ایک ناچیز خادم ہوں جو جد و جہد کر رہا ہوں اور جس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔

میری زندگی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے اور میری تمام سرگرمیاں ایک دوسرے

سے وابستہ ہیں اور ان تمام سرگرمیوں کا منبع بنی نوع انسان کے لئے میری ناقابلِ تسکین محبت ہے ۔

میری تعلیمات جذبات پر مبنی نہیں اور نہ ہی یہ ناقابلِ عمل ہیں۔ جن باتوں کی میں تعلیم دے رہا ہوں وہ بہت پرانی ہیں۔ میں جن باتوں کا پرچار کر رہا ہوں اس پر خود بھی عمل کرنے کی سوچتا ہوں۔ میرا محض اتنا دعویٰ ہے کہ جس بات پر میں عمل کر سکتا ہوں اس پر دوسرے لوگ بھی عمل کر سکتے ہیں کیوں کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ایک عام فانی انسان ہوں اور مجھ میں بھی عام لوگوں کی طرح کمزوریاں موجود ہیں ۔

میرا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو چیز میرے لئے ممکن ہے وہ ایک بچے کے لئے بھی ممکن ہے ۔ یہ بات کہنے کے لئے میرے پاس معقول دلائل موجود ہیں۔ سچائی کی تلاش کے لئے استعمال کئے جانے والے اوزار جتنے مختلف ہیں اتنے ہی سادہ بھی ہیں۔ ایک متکبر شخص کی نظروں میں ان اوزاروں سے کام لینا ناممکن ہے کیوں کہ ایک معصوم بچے کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے۔ سچائی کی تلاش کرنے والے شخص کو اپنے آپ کو خاک سے بھی زیادہ حقیر سمجھنا چاہئے۔ دنیا خاک کو پاؤں تلے روندتی ہے لیکن سچائی کے متلاشی کو اپنے آپ کو خاک سے کمتر سمجھنا چاہئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم سچائی کی جھلک نہیں دیکھ سکتے۔

مجھے یوگی کہنا صحیح نہیں ہے جو نظریات میری زندگی کو ایک ضابطے میں رکھے ہوئے ہیں اور بنی نوع انسان کے لئے بالعموم پیش کئے جاتے ہیں وہ میں نے بتدریج اخذ کئے ہیں۔ ہر قدم اچھی طرح سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے۔ پرہیزگاری اور عدم تشدد دونوں میں نے اپنے تجربوں سے سیکھے ہیں اور عوامی خدمت کے فرائض کی انجام دہی کے

کے لیے ان پر عمل کرنا ضروری ہوگیا۔ جنوبی افریقہ میں مجھے جس طرح کی زندگی گذارنی پڑ رہی تھی اس کا تقاضا تھا کہ خواہ گھریلو معاملات ہوں یا وکالت یا سماجی و سیاسی فرائض کی انجام دہی ہو یا میری جنسی زندگی ایک کڑے ضابطے کی پابند ہو اور میں اپنے ملک کے باشندوں یا یورپینوں کے ساتھ اپنے متعلقات کی بنیاد مکمل عدم تشدد یا سچائی پر رکھوں۔ میں ایک اوسط انسان سے زیادہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا جس میں کہ ایک اوسط انسان سے بھی کم قابلیت ہے۔ میں بڑی تگ و دو کے بعد پرہیز گاری اور عدم تشدد کی جس منزل پر پہنچا ہوں اس کے لئے بھی میں اپنے اندر کسی خاص وصف کی موجودگی کا دعویٰ نہیں کرتا مجھے اس امر پر رتی بھر شک نہیں کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ کوئی بھی شخص حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسی اُمید و یقین کے ساتھ اتنی ہی کوشش کرے۔

میرے نزدیک نجات کا راستہ اپنے ملک اور اس کے ذریعے بنی نوع انسان کی خدمت کی مسلسل کوشش ہے میں ہر زندہ چیز سے ہم آہنگی کا خواہاں ہوں گیتا کے الفاظ میں میں دوست دشمن دونوں کے ساتھ امن سے رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اگرچہ ایک مسلمان، ایک عیسائی یا ایک ہندو میرے ساتھ نفرت کر سکتا ہے مگر میں اس کے ساتھ محبت آمیز سلوک کروں گا اور اس کی خدمت اپنے بیوی بچوں کی طرح ہی کروں گا، خواہ وہ مجھ سے نفرت ہی کرے۔ اس طرح وطن کے لئے میری محبت ابدی امن و آزادی کی منزل کی طرف میرے سفر کے ایک مرحلے کی حیثیت رکھتی ہے اس طرح آپ، دیکھیں گے کہ میری سیاست ایسی نہیں ہے جس میں دھرم کو کوئی مقام حاصل نہ ہو۔ سیاست کو دھرم کا تابع ہونا چاہیے۔ جس سیاسیات میں دھرم کو کوئی مقام حاصل نہ ہو وہ موت کا جال ہے۔ کیوں کہ اس سے روح کی موت واقع ہو جائے گی۔

عالمگیر اور ہر چیز میں موجود اسچائی کو روبرو دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان ادنیٰ ترین مخلوقات سے بھی اسی طرح محبت کرے جس طرح کہ اپنے آپ سے کرتا ہے۔ جو انسان اس کا متلاشی ہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے سچائی سے میری عقیدت مجھے سیاست میں کھینچ لائی ہے اور میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بغیر بلکہ بڑی انکساری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دھرم کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں، انھوں نے دھرم کو سمجھا ہی نہیں۔

جب میں کسی شخص کو غلطی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے بھی غلطی کی ہے جب میں کسی شہوت پرست انسان کو دیکھتا ہوں تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ میں بھی کسی وقت ایسا ہی تھا۔ اور اس طرح مجھے دُنیا میں ہر ایک کے ساتھ اپنا رشتہ نظر آتا ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں تب تک خوش نہیں رہ سکتا، جب تک کہ ہم میں سے ادنیٰ ترین شخص بھی خوش نہ ہو۔

میری طاقت کا راز یہ ہے کہ میں لوگوں کو کوئی ایسی بات کرنے کو نہیں کہتا جو میں نے اپنی زندگی میں خود کئی بار نہ کی ہو۔

میرے فلسفۂ زندگی میں مقاصد اور اُنہیں حاصل کرنے کے ذرائع متبادل اصطلاحیں ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ذرائع آخر کار ذرائع ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ انجام کار ذرائع ہی سب کچھ ہیں۔ کیوں کہ جیسے ذرائع ہوں گے مقاصد بھی ویسے ہی ہوں گے۔ مقاصد اور ذرائع کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ خالق حقیقی نے ہمیں ذرائع پر اختیار (اگرچہ بہت محدود) دیا ہے۔ لیکن مقاصد کی صورت میں ایسا نہیں ہے بمقصد کا حصول

بالکل اس کے لئے اختیار کئے جانے والے ذرائع کے تناسب سے ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کسی استثنا کی کوئی گنجائش نہیں۔

ذرائع کو ہم بیج سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور مقصد کو درخت سے۔ ذرائع اور مقصد کے درمیان وہی رشتہ ہے جو بیج اور درخت میں ہے۔

میں خالص عدم تشدد پر مبنی عمل اور ایسے ذرائع اختیار کرنے کے حق میں ہوں جو کھلم کھلا سب کے سامنے کئے جائیں۔ مجھے چوری چھپے کے کاموں سے نفرت ہے۔

تمام گناہ چوری چھپے کئے جاتے ہیں۔ جس لمحے ہمیں یہ احساس ہو جائے گا کہ اعمال تو ایک طرف، خدا ہمارے خیالوں سے بھی واقف ہے، اسی لمحے ہم آزاد ہو جائیں گے

ناجائز ذرائع اختیار کرنے کا انجام بھی بُرا ہوتا ہے۔ کوئی شخص جھوٹ کے راستے سے سچائی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ سچے عمل کے ذریعے ہی سچائی کی منزل تک پہنچنا ممکن ہے۔

کامیابی یا ناکامیابی ہمارے ہاتھوں میں نہیں۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اپنا فرض اچھی طرح ادا کریں۔ ہمارا فرض صرف کوشش کرنا ہے۔ انجام وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہوگا۔

پچاس سال سے زیادہ عرصے سے میں نے اپنے آپ کو اس بات کی تربیت دی ہے کہ مجھے نتائج کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ مجھے صرف کام کے ذرائع کا دھیان رکھنا چاہئے۔ اور جب مجھے ذرائع کے جائز ہونے کا یقین ہو تو میرا عقیدہ میری رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ تمام خوف اس عقیدے کے سامنے دور جاتا ہے۔

زندگی بھر سچائی پر زور دینے کی خصلت نے ہی مجھے سمجھوتے کی خوبی کی قدر کرنا بھی سکھایا ہے۔ بعدازاں میں نے یہ دیکھا کہ یہ جذبہ ستیہ گرہ کا لازمی جزو ہے۔ اس کی بدولت مجھے کئی بار دوستوں کی ناراضگی مول لینا پڑی ہے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑا ہے لیکن سچائی جہاں پتھر کی طرح سخت ہے وہاں پھول کی طرح نرم و نازک بھی ہے۔

مجھے اکثر غلط سمجھا گیا ہے اور میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ ہر عوامی کارکن کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ سخت جان ہو۔ اگر ہر غلط فہمی کی صفائی پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے تو زندگی ایک بوجھ بن جائے گی۔ یہ میری زندگی کا اصول رہا ہے کہ غلط فہمیوں کے ازالے کی ضرورت اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ مقصد کی تصحیح کی ضرورت نہ ہو۔ اس اصول پر عمل کرنے سے میرا بہت سا وقت بچ جاتا ہے اور تشویش بھی کم ہوتی ہے۔

میں تو محض سچائی کا متلاشی ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں نے سچائی تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیا ہے اور میرا یہ بھی دعویٰ ہے کہ میں سچائی کو پانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔ سچائی کو مکمل طور پر پا لینا اپنے آپ کو اور اپنے مقصد کو پا لینے کے یعنی تکمیل کو پہنچ جانے کے مترادف ہے۔ مجھے اپنی خامیوں کا پورا احساس ہے اور اسی میں میری تمام طاقت کا راز ہے کیوں کہ انسان کو شاذ و نادر ہی اپنی کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے۔

مجھے صرف سچائی سے عقیدت ہے اور مجھ میں جو نظم و ضبط ہے وہ محض سچائی کی دین ہے۔

میں ہمیشہ پُر امید رہتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے اپنی ذات پر بھروسہ ہے یہ بات

بہت متکبرانہ معلوم ہوگی۔ لیکن یہ بات بڑے عجز و انکساری کے ساتھ کہی گئی ہے۔ میں خدا کے قادرِ مطلق ہونے میں اعتقاد رکھتا ہوں میں سچائی میں اعتقاد رکھتا ہوں اور اسی لئے مجھے اس ملک میں یا بنی نوع انسان کے مستقبل کے بارے میں کوئی شبہ نہیں

میں یہ نہیں کہتا کہ ہر قدیم چیز محض اس لئے اچھی ہے کہ وہ قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ خدا نے ہمیں دلیل سے کام لینے کی جو قوت بخشی ہے ہم قدیم روایات کی خاطر اس سے کام نہ لیں۔ کوئی بھی روایت خواہ وہ کتنی ہی قدیم ہو اگر وہ اخلاق سے مطابقت نہیں رکھتی تو اُسے ترک کر دینا چاہیئے چھوت چھات کو ایک قدیم روایت سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بچپن کی شادیوں اور بچپن کی بیوگی کو اور کئی افسوسناک اعتقادات اور توہم پرستی کو قدیم روایات کہا جا سکتا ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہو تو میں ان تمام روایات کو ختم کر دوں۔

میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم انسان سے ڈرنا چھوڑ دیں اور صرف خدا کی حقیقت کے متلاشی بن جائیں تو ہم سب خدا کے پیغامبر بن سکتے ہیں میرا پختہ یقین ہے کہ میں محض خدا کی حقیقت کی تلاش کر رہا ہوں اور مجھ میں انسان کا خوف قطعی نہیں ہے۔

میں یک رنگی اور یکسانیت کو کبھی بنانا نہیں چاہتا۔ میں سچائی کا داعی ہوں اور کسی موضوع پر کسی خاص لمحے جو کچھ بھی سوچتا یا محسوس کرتا ہوں وہ کہہ دیتا ہوں اس کا خیال کئے بغیر کہ میں نے پہلے اس کے بارے میں کیا کہا تھا۔ روزمرہ کے تجربے سے جوں جوں میرا نقطۂ نظر زیادہ واضح ہوتا جائے گا، میرے خیالات بھی زیادہ صاف ہوتے جائیں گے جب میں نے کسی معاملے پر اپنی رائے میں جان بوجھ کر تبدیلی کی ہے تو یہ تبدیلی صاف طور پر نظر آنی چاہیئے، البتہ دھیان سے دیکھنے والی آنکھ ہی ارتقاء کے

اس عمل کو دیکھ سکتی ہے۔

میرا مدعا یہ نہیں کہ کسی معاملے پر میں پہلے جو کچھ کر چکا ہوں، اب اس میں کوئی تبدیلی نہ کروں۔ میرا مقصد تو محض سچائی کی اس صورت سے مطابقت قائم رکھنا ہے، جسے میں کسی خاص لمحے میں دیکھتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سچائی کی تلاش میں زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

میرے ساتھ معاملہ طے کرنا بڑا آسان ہے۔ کیونکہ کسی ایک خیال پر مضبوطی سے قائم رہتا ہوں لیکن جونہی مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے تو میں اُسے فوراً ترک کر دیتا ہوں

میں مستقبل کا حال جاننے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ میرا تعلق زمانہ حال سے ہے۔ خدا نے مجھے آئندہ ہونے والے واقعات کو کنٹرول کرنے کی طاقت نہیں دی۔

ہمارے چاروں طرف جو گہرا اندھیرا ہے وہ لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ خدا نے ہمیں صرف ایک قدم آگے تک دیکھنے کی طاقت دی ہے۔ اور اگر ہمیں خدا کی رحمت سے اتنی روشنی میسر آجائے کہ ہم اتنا فاصلہ بھی دیکھ لیں تو یہ ہمارے لئے کافی ہوگا۔ تب ہم نیومین کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہہ سکتے ہیں "میرے لئے، ایک قدم آگے بڑھانا ہی کافی ہے" اور ہم اپنے گزشتہ تجربے کی بنا پر اس بات کا یقین کر سکتے ہیں۔ کہ اگلا قدم ہمیشہ نظر آئے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ اندھیرا اتنا گہرا نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ یہ اسی وقت زیادہ گہرا نظر آتا ہے جب ہم بے صبری کے عالم میں ایک قدم سے آگے کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

میں اعتقاد رکھنے والا انسان ہوں۔ میرا بھروسہ صرف خدا پر ہے میرے لئے،

ایک قدم آگے بڑھانا ہی کافی ہے اور جب وقت آئے گا تو خدا خود مجھ پر یہ بات واضح کر دے گا کہ میرا دوسرا قدم کیا ہونا چاہیئے۔

میں ایک ادنیٰ انسان ہوں جو پوری طرح اچھا بننے کی، سچا بننے کی اور خیال قول اور عمل میں ہمیشہ عدم تشدد پر کاربند رہنے کی جدوجہد کر رہا ہوں، لیکن میں اس منزل تک پہنچنے میں ہمیشہ ناکامیاب رہتا ہوں جسے میں سچ سمجھتا ہوں میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسی کوشش ہے جو سخت کوشی کی طالب ہے لیکن یہ تکلیف میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔ ہر قدم، جو میں آگے بڑھاتا ہوں، اس سے میں اپنے آپ کو زیادہ طاقتور اور دوسرا قدم اٹھانے کا زیادہ اہل سمجھتا ہوں۔

میرے پاس اس کے سوا اور کوئی طاقت نہیں جو کہ سچائی پر زور دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ عدم تشدد کا منبع بھی یہی ہے۔

میں خوبصورتی کو سچائی میں اور سچائی کے ذریعے ہی دیکھتا ہوں۔ تمام سچائیاں، نہ صرف سچے خیال ہی بلکہ سچے چہرے، سچی تصویریں اور سچے گیت سبھی انتہائی خوبصورت ہیں۔ لوگ عام طور پر سچائی میں خوبصورتی کو دیکھ نہیں پاتے۔ عام انسان اس سے دور بھاگتا ہے اور اس میں پنہاں خوبصورتی اسے نظر نہیں آتی۔ جب لوگ سچائی میں خوبصورتی پہچاننا شروع کر دیں گے تو صحیح آرٹ پیدا ہوگا۔

زندگی تمام آرٹ سے بڑی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ انسان جس کی زندگی تکمیل کے قریب پہنچ جاتی ہے سب سے بڑا آرٹسٹ ہے کیوں کہ ایک اچھی زندگی کے ڈھانچے اور یقینی بنیادوں کے بغیر آرٹ کہاں رہ جاتا ہے۔

جوں جوں میری زندگی کا اختتام قریب آ رہا ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی

کی پاکیزگی سب سے بڑا اور سچا آرٹ ہے۔ مشق کے بعد اچھی سے اچھی آواز پیدا کرنے کا آرٹ تو کئی انسان سیکھ سکتے ہیں لیکن ایک پاکیزہ زندگی کی سُروں سے اس قسم کا سنگیت کوئی کوئی انسان ہی پیدا کر سکتا ہے۔

مجھے اپنے ملک کے لوگوں کی مصیبت کو دُور کرنے سے زیادہ تشویش اس بات کی ہے کہ انسانی فطرت پر وحشی پن کو غالب آنے سے روکا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ جو لوگ رضاکارانہ طور پر دُکھ درد جھیلتے ہیں وہ اپنا اور تمام بنی نوع انسان کا رتبہ بلند کرتے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لوگ اپنے مخالفین پر فتح پانے یا کمزور اقوام اور کمزور افراد کو لوٹنے کی زبردست کوششوں کے نتیجے میں وحشی بن جاتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ بنی نوع انسان کو بھی نیچے گراتے ہیں۔ انسانی فطرت کو اس طرح پستی میں جاتے دیکھنا میرے لئے یا کسی اور شخص کے لئے خوشی کا مقام نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم سب ایک ہی خدا کی اولاد ہیں۔ اور ہم میں ایک ہی خدائی طاقت پائی جاتی ہے تو دوسروں کے گناہ میں ہم بھی شریک ہیں خواہ گناہ کرنے والے یہ اشخاص ہماری نسل سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور نسل سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی انسان میں حیوانیت کے جذبے کو بیدار کرنا کس قدر ناگوار فعل ہے۔

میرا مقصد دُنیا کے ساتھ دوستی پیدا کرنا ہے اور میں بُرائی کی انتہائی مخالفت کے ساتھ انتہائی محبت بھی شامل کر سکتا ہوں۔

میں کسی فریب کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک ستیہ گرہ کا قاعدہ، محبت کا قاعدہ ہے اور ایک مستقل اصول ہے۔ میں ہر اچھی چیز سے تعاون کرتا ہوں

اور ہر بُرائی کے ساتھ عدم تعاون کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔

پاکیزگی حاصل کرنے کے مسلسل کوششوں کے باوجود میرے اندر کچھ ایسی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جس کی بدولت میں اندر کی آواز کو زیادہ صاف اور صحیح سُن سکوں۔

مجھ پر خصوصی طور پر خدا کی مرضی منکشف نہیں ہوئی ہے بلکہ میرا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ خدا ہر روز ہر شخص کے سامنے ظاہر ہوتا ہے لیکن ہم اپنے کان "اندر کی ہلکی سی آواز" کے لیے بند کر دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو روشن منارہ ہے اس سے ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ لیکن میں ہر مقام پر خدا کی موجودگی کو محسوس کرتا ہوں۔

اگر میں دنیا میں کسی جابر شخص کو تسلیم کرتا ہوں تو وہ "ہمارے اندر کی ہلکی سی آواز ہے۔"

جو کوئی اس آواز کو سُننا چاہے وہ سُن سکتا ہے۔ یہ آواز آپ کے اندر سے آتی ہے لیکن اس کام کے لیے باقی کاموں کی طرح تیاری کی ضرورت ہے۔

جونہی میں اپنے اندر کی ہلکی سی آواز کو دبا دوں گا، اسی لمحے میری افادیت ختم ہو جائے گی۔

اندرونی آواز کو سُننے اور اس پر عمل کرنے کی اہلیت سے ہی مجھے موجودہ طاقت ملی ہے اور اُس نے مجھے ملک کی کچھ خدمت کرنے کے قابل بنایا ہے۔ زندگی کی اس منزل پر میں اپنا راستہ بدل کر اندرونی آواز کے بجائے کسی اور آواز کو سننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب آپ کو اپنے بہترین دوستوں کی مرضی کے خلاف بھی کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی فرض کی انجام دہی کے سلسلے میں کشمکش

کاسامنا ہو تو آپ کا آخری فیصلہ اندرونی آواز کے تابع ہونا چاہیئے۔

زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب ہمیں کچھ باتوں کے بارے میں کسی بیرونی ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہمارے اندر کی آواز ہی ہمیں یہ بتا دیتی ہے "تم ٹھیک راستے پر ہو۔ دائیں بائیں بلکہ سیدھے اور تنگ راستے پر ہی چلتے جاؤ"۔

زندگی اور موت دونوں ہی ایک راز ہیں۔ اگر موت کے بعد کوئی اور زندگی شروع نہیں ہوتی تو یہ درمیانی وقفہ ایک مذاق ہے ہمیں موت کا غم نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ یہ کسی وقت یا کسی کو بھی آجائے۔ میرے خیال میں ہم ایسا تبھی کر سکتے ہیں جب ہم اپنے آپ سے بے تعلقی کا فن سیکھ لیں اور یہ فن ہم اسی صورت میں سیکھ سکتے ہیں جب ہمیں ہر لمحے اس بات کا احساس رہے کہ ہمیں جو کام سونپا گیا ہے۔ ہم اسے اچھی طرح انجام دے رہے ہیں۔

زندگی میں کبھی ایسی حالت بھی پیدا ہو جاتی ہے جب انسان اپنے خیالوں کو کسی عمل کے ذریعے بھی آشکار کرنا نہیں چاہتا، اُن کے اعلان کی بات تو الگ رہی محض خیالات ہی بڑے کارآتے ہیں۔ اور اُن میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر بظاہر کسی شخص کی بے عملی ہی اُس کا عمل بن جاتی ہے۔ میری کوشش بھی اس منزل کی طرف پہنچنے کے لئے رہی ہے۔

کیا مجھ میں بہادروں کا عدم تشدد موجود ہے؟ اس کا جواب میری موت کے وقت ہی ملے گا۔ اگر کسی نے مجھے مار دیا اور میں قاتل کے لئے دعا کرتا ہوا، اور اپنے دل میں خدا کو یاد کرتا ہوا اور اُس کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے مرا تب ہی یہ کہنا ممکن ہو گا کہ میرا عدم تشدد بہادروں کا عدم تشدد ہے۔

میں ایسی موت مرنا نہیں چاہتا جس میں قویٰ جواب دے جائیں اور میں ایک معذور انسان کی موت مروں۔ اگر کوئی قاتل گولی مار کر میرا خاتمہ کر دے تو میں اُسے خوش آمدید کہوں گا۔ لیکن سب سے بڑھ کر میری یہ خواہش ہو گی کہ آخری دم تک اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مروں۔

اگر میں کسی طویل بیماری سے یا حتیٰ کہ پھوڑے پھنسی ایسی معمولی تکلیف سے بھی مروں تو لوگوں کی ناراضی کا خطرہ مول لے کر بھی دنیا کے سامنے یہ اعلان کرنا آپ کا فرض ہو گا کہ میں خدا کا بندہ نہیں تھا جس کا کہ میں دعویٰ کرتا تھا۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اس سے میری رُوح کو تسکین ملے گی۔ یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ اگر کوئی شخص گولی مار کر میری زندگی کا خاتمہ کر دے جیسا کہ کچھ دن پہلے ایک بم پھینک کر ایسا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تو میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے ہوئے اور خدا کو یاد کرتے ہوئے جان دے دوں، تبھی میرا دعویٰ درست ثابت ہو سکتا ہے کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ (یہ الفاظ ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء کی رات کو گولی چلائے جانے کے واقعہ سے صرف ۲۰ گھنٹے پہلے کہے گئے تھے۔)

جب میں زندہ نہیں رہوں گا تو کوئی بھی ایک شخص مکمل طور پر میری نمائندگی نہیں کر سکے گا۔ لیکن میری زندگی کا کچھ حصہ آپ میں سے بہت سے لوگوں کی زندگی میں باقی رہے گا۔ اگر ہر ایک انسان اپنے نصب العین کو اوّلین اور اپنی ذات کو آخری مقام دیدے تو یہ خلا بہت حد تک پورا ہو جائے گا۔

میرے احباب میری سب سے زیادہ عزت یہی کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں اس پروگرام پر عمل کریں جس کا میں داعی ہوں، اور اگر اس پر اُن کا

اعتقاد نہ ہو تو اس کی زبردست مخالفت کریں۔ عمل کے اس زمانے میں اندھا دھند تقلید بالکل بے کار چیز ہے جو اکثر پریشان کن اور تکلیف دہ بھی ہو جاتی ہے۔

میں دوبارہ جنم لینا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر مجھے دوبارہ جنم بھی لینا پڑے تو میں ایک اچھوت کی حیثیت سے جنم لینا چاہوں گا تاکہ میں اُن کے دُکھ درد میں شریک ہو سکوں۔ اُن کی جو تحقیر کی جاتی ہے اُس میں حصہ دار بن سکوں اور اُنہیں اور اپنے آپ کو اس افسوسناک صورتِ حالات سے نجات دلانے کی کوشش کر سکوں۔ اس لئے میری یہ دُعا ہے کہ اگر میں دوبارہ جنم لوں تو ایک برہمن، کھتری، ویش یا شودر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اتی شودر کی حیثیت سے جنم لوں۔

۱۴۔ تمام مذاہب کی رُوح ایک ہے

عقیدے کے بغیر یہ دُنیا صفر کے برابر ہے۔ سچا عقیدہ ان لوگوں کے عقل کے تجربات کو اپنی ذات میں سمو لیتا ہے جن کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہوں کہ انھوں نے عبادت و ریاضت کے ذریعے ایک پاکیزہ زندگی بسر کی۔ اس لئے پیغامبروں یا اوتاروں میں جو مدتوں پہلے پیدا ہوئے، اعتقاد رکھنا محض توہم پرستی نہیں ہے بلکہ انسان کی رُوحانی تشنگی کی تسکین کا ذریعہ ہے۔

کچھ ایسے موضوعات ہیں جن پر عقل ہمیں زیادہ دُور نہیں لے جا سکتی اور ہمیں عقیدے کی بنیاد پر ہی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں اعتقاد عقل سے ٹکراتا نہیں بلکہ اس سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ عقیدہ ایک طرح کی چھٹی حِس ہے جو اِن حالتوں میں کام کرتی ہے۔ جہاں عقل کی رسائی نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عقل کو پس پشت ڈال دیا جائے بلکہ ہمارے اندر جو رُوحانی عنصر موجود ہے اس کو مناسب حد تک تسلیم کیا جائے تاکہ عقل کو بھی تقدس حاصل ہو جائے۔

عقیدہ کوئی ایسا نازک پھول نہیں ہے جو معمولی سا طوفان آنے پر ہی مرجھا جائے گا۔ عقیدہ تو ہمالیہ پہاڑ کی مانند ہے جس کا بدلنا ممکن نہیں۔ کسی بھی طوفان کا ہمالیہ پہاڑ کی بُنیادوں کو ہلانا ممکن نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک شخص خدا اور

مذہب میں ایسا ہی عقیدہ رکھے۔

مذہب سے میری مراد رسمی مذہب یا مذہبی رسومات سے نہیں بلکہ اس مذہب سے ہے جو تمام مذاہب کی رُوح ہے اور جو ہمیں خالق سے ملاتی ہے۔

بلاشبہ مذہب کو ہمارے ہر عمل میں جاری و ساری ہونا چاہیئے۔ یہاں مذہب سے مراد کوئی گروہ یا فرقہ نہیں۔ بلکہ اس سے مراد دُنیا کے لئے ایک منضبط اخلاقی حکومت میں اعتقاد رکھنا ہے۔ یہ نظام محض اس وجہ سے کچھ کم حقیقی نہیں کہ یہ دکھائی نہیں دیتا یہ مذہب ہندوازم، اسلام، عیسائیت وغیرہ سے بالاتر ہے۔ یہ اُن کی جگہ نہیں لیتا بلکہ اُن میں یگانگت پیدا کر کے اُنہیں ایک حقیقی رُوپ دیتا ہے۔

مختلف مذاہب ایک ہی منزل پر پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ جب تک منزل ایک ہے راستوں کا مختلف ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

مجھے لفظ رواداری پسند نہیں لیکن مجھے اس سے اچھا کوئی اور لفظ سوجھ بھی نہیں سکا۔ رواداری، میں دوسرے فریق کے عقیدے کو اپنے عقیدے سے کمتر سمجھ کر برداشت کرنے کے خیال کی موجودگی کا امکان بھی ہو سکتا ہے جبکہ اہنسا ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ دوسروں کے مذہبی عقائد کا بھی اتنا ہی احترام کیا جائے جتنا کہ ہم اپنے عقیدے کا کرتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ تسلیم کریں گے کہ ہمارا اپنا عقیدہ مکمل نہیں ہے۔ سچائی کا متلاشی، جو محبت کے قاعدے کی پیروی بھی کرتا ہوں، اس بات کو فوراً تسلیم کرے گا۔ اگر ہم نے مکمل سچائی کو پالیا ہوتا تو ہم سچائی کے متلاشی نہ ہوتے بلکہ خدا کے ساتھ ایک ہو گئے ہوتے کیوں کہ سچائی خدا کا دوسرا نام ہے لیکن ہم سچائی کے متلاشی ہونے کی حیثیت سے اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں اور اس طرح ہمیں اپنے

نامکمل ہونے کا احساس بھی رہتا ہے۔ اگر ہم خود نامکمل ہیں تو وہ مذہب جس کا تصور ہمارے ذہن میں ہوتا ہے، بھی نامکمل ہوگا۔ ہم نے مذہب کو اس کی مکمل صورت میں نہیں سمجھا جس طرح کہ ہم نے خدا کو نہیں سمجھا۔ چونکہ مذہب کی وہ شکل جو ہمارے ذہن میں ہے، نامکمل ہے، اس لئے اس میں ہمیشہ ارتقا کی گنجائش رہتی ہے۔ انسان میں موجود تصور کے مطابق تمام عقیدے نامکمل ہیں تو پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کون مذہب اچھا ہے۔ تمام عقیدے سچائی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن تمام ہی نامکمل ہیں اور ان میں غلطی کا امکان ہے۔ دوسرے عقیدوں کے لیے احترام کے نتیجے میں ہماری آنکھیں اُن کی خامیوں کی طرف بند نہیں ہو جانی چاہئیں۔ ہمیں اپنے عقیدے کی خامیوں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اس بنا پر اُسے ترک نہیں کر دینا چاہئے۔ بلکہ ان خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تمام مذاہب کو ایک ہی نظر سے دیکھنے سے ہم دُوسروں کے عقائد کے تمام قابلِ قبول پہلوؤں کو اپنے عقیدے کا جزو بنانے میں نہ صرف کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ بلکہ اسے اپنا فرض بھی سمجھیں گے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مختلف عقیدوں کی کیا ضرورت ہے روح ایک ہے لیکن جن جسموں میں یہ رُوح جان ڈالتی ہے وہ کئی ہیں۔ ہم جسموں کی تعداد کو کم نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم رُوح کی ایکتا کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح کسی درخت کا تنا ایک ہی ہوتا ہے لیکن شاخیں اور پتے کئی کئی ہوتے ہیں، اسی طرح سچا اور مکمل مذہب ایک ہی ہے جو مختلف انسانوں کے ذریعے کئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ مذہب کی رُوح احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ نامکمل افراد اپنی سمجھ کے مطابق اُسے نامکمل الفاظ میں بیان کرتے ہیں ایسے ہی اور دُوسرے نامکمل افراد اُن کے بیان سے مختلف معنی نکالتے ہیں۔ اُن میں

سے کون سے معنی درست سمجھے جائیں؟ ہر شخص اپنے نقطۂ نگاہ سے درست ہے لیکن یہ بات ناممکن نہیں کہ ان میں سے ہر شخص غلطی پر ہو۔ اسی لئے رواداری کی ضرورت ہے جس کا مطلب اپنے عقیدے سے بے اعتنائی اختیار کرنا نہیں بلکہ اُس کے لئے زیادہ سوچی سمجھی اور زیادہ پاک محبت کا اظہار کرنا ہے۔ رواداری برتنے سے ہمیں روحانی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ رواداری کٹرپن سے اتنی ہی دُور ہے جتنا کہ قطب شمالی سے قطب جنوبی۔ مذہب کا سچا گیان عقائد کے درمیان حائل دیواروں کو گرا دیتا ہے۔

دوسرے عقائد کے لئے رواداری کے جذبے سے ہمیں اپنے عقیدے کو بھی زیادہ اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملے گی۔ رواداری سے مراد غلط اور صحیح یا نیکی اور بدی کے امتیاز کو فراموش کرنا نہیں۔ یہاں قدرتی طور پر دنیا کے اہم عقائد کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان سب کی بنیادیں مشترک ہیں اور ان سب نے عظیم سنت اور مہاتما پیدا کئے ہیں۔

میں دُنیا کے تمام بڑے مذاہب کی بنیادی سچائی کا معتقد ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ سب خدا کے دیئے ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے ضروری تھے جن پر اُن مذاہب کا نزول ہوا۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر ہم مختلف مذاہب کی مقدس کتاب کو اُن مذاہب کے پیروؤں کے نقطۂ نگاہ سے پڑھ سکیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ بنیادی طور پر یہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں اور ایک دُوسرے کے معاون ہیں۔

ایک خدا پر ایمان تمام مذاہب کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن میں کسی ایسے زمانے کا تصور نہیں کر سکتا جبکہ دُنیا میں عملی طور پر ایک ہی مذہب ہو گا۔ نظری طور سے چونکہ خدا ایک ہی ہے اس لئے مذہب بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن عملی طور سے

مجھے کوئی بھی دو اشخاص ایسے نہیں ملے جن کا خدا کے بارے میں بالکل ایک سا نظریہ ہو۔ لہٰذا مختلف مزاجوں اور موسمی حالات کے پیش نظر دُنیا میں مختلف مذاہب کا وجود رہے گا۔

مذاہب انسان کو انسان سے جدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اُن کو باہم ملانے کے لئے ہیں۔

مجھے تمام انسانوں سے — نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دُنیا کے انسانوں سے جو مختلف عقائد کو ماننے والے ہیں، محبت کرنی چاہئے۔ تاکہ ہم ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کرکے بہتر انسان بن سکیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو دُنیا آج کی نسبت بہت اچھی بن جائے گی۔ میں وسیع پیمانے پر رواداری کی اپیل کرتا ہوں اور اسی مقصد کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ میں لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ وہ ہر مذہب کا مطالعہ اُس مذہب کے پیرؤوں کے زاویۂ نگاہ سے کریں۔ میں اپنے خوابوں کے ہندوستان میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ اس میں ایک ہی مذہب ہو۔ یعنی کہ ہندوستانی صرف ہندو، عیسائی یا مسلمان ہوں۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تمام مذاہب کے لوگ شانہ بہ شانہ کام کریں اور اُن میں پورے طور پر رواداری موجود ہو۔

وقت کا تقاضا یہ نہیں کہ مذہب ایک ہوں بلکہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب کو ماننے والے ایک دوسرے کا احترام کریں اور رواداری سے کام لیں۔ ہم بے جان یکسانیت نہیں چاہتے بلکہ کثرت میں وحدت دیکھنا چاہتے ہیں۔ روایات اور وراثت، آب و ہوا اور ماحول کے اثرات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہ صرف ناکامیاب بلکہ مذہب کی بے حرمتی کے مترادف ہو گی۔ تمام مذاہب کی رُوح

ایک ہی ہے لیکن مظاہر جدا جدا ہیں۔ رُوح کا وجود ہمیشہ قائم رہے گا اور دانش مند انسان ظاہری خول کو نظر انداز کر کے مختلف اجسام میں موجود ایک ہی رُوح کو پہچان لیتے ہیں اگر ہندو یہ چاہیں کہ اسلام، عیسائیت یا زرتشتی مذہب ہندوستان سے ختم ہو جائے تو یہ ایک اتنا ہی بے کار خواب ہوگا جتنا کہ مسلمانوں کے لئے یہ سوچنا کہ اسلام کی ہی دُنیا پر حکمرانی ہو۔ لیکن اگر اسلام سے مراد ایک خدا میں اعتقاد اور اس نظریے پر اعتقاد رکھنا کہ پیغامبروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا ہے، تو ہم سب ہی مسلمان ہیں لیکن ہم ہندو اور عیسائی بھی ہیں۔ سچائی کسی ایک مقدس کتاب کی واحد ملکیت نہیں ہے۔

ہم اپنے آپ کو ہندو، عیسائی یا مسلمان کہہ سکتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اس کثرت کی تہہ میں ایک ایسی وحدت ہے جس کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ تمام مذاہب کی تہہ میں ایک مذہب ہے۔ جہاں تک میرے تجربے کا تعلق ہے کسی نہ کسی موقعہ پر ہم سب پر، خواہ ہم مسلمان ہوں، ہندو ہوں یا عیسائی ہوں یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ ہمارے درمیان مماثلت زیادہ ہے اور مغائرت کم۔

میرے نزدیک ہر مذہب اسی احترام کے قابل ہے جس احترام کا خود میرا مذہب ہے۔ میرے نزدیک تبدیلیٔ مذہب کا کوئی خیال بھی جائز نہیں۔ ہمیں ایک ہندو کو زیادہ اچھا ہندو بننے میں، ایک مسلمان کو زیادہ اچھا مسلمان بننے میں اور ایک عیسائی کو زیادہ اچھا عیسائی بننے میں مدد دینی چاہیئے ہمیں اپنے دلوں میں چھپے ہوئے گھمنڈ کے اس جذبے کو دُور کر دینا چاہیئے کہ ہمارا مذہب زیادہ سچا ہے اور دوسروں کا مذہب کم سچا ہے۔ تمام دوسرے مذاہب کے لئے ہمارا رویہ بالکل صاف اور مخلصانہ ہونا چاہیئے۔ دوسروں کے لئے ہماری دلی پرارتھنا یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ "اے خدا

اسے وہی روشنی عطا کر جو تو نے مجھے عطا کی ہے" بلکہ یہ ہونی چاہئے کہ "اے وہ تمام روشنی اور سچائی عطا کر جو اس کی پوری نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔" اگر کچھ لوگ تبدیلیٔ مذہب کا خیال کریں تو میں اُن کی آزادی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا لیکن انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے افسوس ضرور ہوگا۔

ہندو مذہب کوئی الگ تھلگ مذہب نہیں۔ اس میں دُنیا کے تمام پیغمبروں کے احترام و عقیدت کی گنجائش موجود ہے۔ یہ عام معنوں میں ایک تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کئی قبیلے اس میں جذب ہوئے ہیں لیکن یہ ایک ارتقائی عمل رہا ہے اور اسے محسوس نہیں کیا گیا۔ ہندو ازم ہر ایک سے یہ کہتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی اپنے عقیدے یا دھرم کے مطابق کرے اور اس لئے اس کا کسی مذہب سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

اگرچہ میں فرقے کے لحاظ سے عیسائی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تاہم حضرتِ عیسیٰ کو جو تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ اُن کی مثال نے عدم تشدد میں میرے عقیدے کو پختہ کرنے میں مدد دی ہے اور یہی عقیدہ میری تمام سرگرمیوں کی بنیاد ہے۔

میں یقیناً اسلام کو ایک الہامی مذہب مانتا ہوں۔ اسی لئے قرآن پاک کو ایک الہامی کتاب حضرت محمد کو ایک پیغمبر سمجھتا ہوں۔

میرا یہ عقیدہ نہیں کہ صرف وید ہی متبرک کتاب ہے۔ میرا یقین ہے کہ بائبل، قرآن اور زند اوستا بھی اتنی ہی متبرک اور الہامی کتابیں ہیں جتنا کہ وید۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں میرے اعتقاد کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے ہر لفظ کو الہامی سمجھوں میں کسی لفظ کے ان معنی کا خواہ وہ کتنے ہی عالمانہ کیوں نہ ہوں، پابند

نہیں ہوسکتا جو عقل و اخلاق کے منافی ہوں۔

میں الفاظ کے پیچھے نہیں چلتا۔ اس لیے میں دُنیا کی مختلف متبرک کتابوں کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اُن کی تعبیر و تشریح، سچائی اور اہنسا کے انہی معیاروں سے کرتا ہوں جنھیں خود اِن متبرک کتابوں نے مقرر کیا ہے جو اس معیار پر پورا نہ اُترے اُسے میں رد اور جو پورا اُترے قبول کر لیتا ہوں۔

سچائی اور راست بازی سے بڑھ کر اور کوئی مذہب نہیں۔

اگر کوئی شخص اپنے مذہب کی رُوح تک پہنچ جائے تو سمجھیے کہ اس نے دُوسرے مذاہب کی رُوح کو بھی پالیا ہے۔

میں ہر اس مذہبی اصول کو ماننے سے انکار کرتا ہوں جسے عقل نہ مانتی ہو اور جو اخلاق کے منافی ہو۔ میں اس غیر منطقی مذہبی جذبے کو برداشت کر لیتا ہوں جو اخلاق کے منافی نہ ہو۔

جونہی ہماری اخلاقی بنیاد ختم ہو جائے ہم مذہبی انسان نہیں رہ جاتے۔ اخلاق سے بالاتر مذہب نام کی کوئی چیز نہیں۔ مثال کے طور پر کوئی انسان جو جھوٹا، ظالم، اور نفس پرست ہو وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خدا اس کے ساتھ ہے۔

جونہی ہم نیکی اور بدی کے درمیان تمیز کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور ماضی کی جسے ہم اچھی طرح نہ سمجھتے ہوں، اندھی تقلید شروع کر دیتے ہیں، تو ہماری نشو و نما رک جاتی ہے۔ ہم ماضی کی بہترین چیزوں کے وارث ہیں۔ اور ہمیں ماضی کی غلطیوں کو دُہرا کر اس ورثے کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔

جہاں خوف ہے وہاں مذہب نہیں ہو سکتا۔

ل بے خوفی سے مراد جارحیت یا تکبر نہیں۔ یہ چیزیں خود خوف کی علامت ہیں۔ بے خوفی وہاں ہی ہو سکتی ہے جہاں تسکینِ قلب اور شانتی ہو۔ اس کے لئے خدا کی ذات پر اعتقاد رکھنا لازمی ہے۔

جہاں تک میں اِن الفاظ کے معنی سمجھ سکا ہوں، میں بُت پرست بھی ہوں اور بُت شکن بھی۔ مورتی پوجا کے پیچھے جو جذبہ ہے۔ اس کی قدر کرتا ہوں۔ یہ جذبہ نسلِ انسانی کو اُوپر اٹھانے میں اہم حصہ لیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ مجھ میں اتنی اہلیت ہو کہ میں اس ملک کے ہزاروں متبرک مندروں کی حفاظت اپنی جان دے کر بھی کر سکوں۔

——— میں کٹڑپن کی شکل میں اُس بُت پرستی کا مخالف ہوں جس کے تحت کسی انسان کو اپنے طریقِ عبادت کے سوا کسی اور طریقِ عبادت میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اس قسم کی بُت پرستی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس میں کوئی واضح شکل موجود نہیں ہوتی جبکہ دُوسری طرح کی پرستش میں پتھر یا سونے کی مورتی سامنے ہوتی ہے۔

میں مندروں کی موجودگی کو کوئی گناہ یا توہم پرستی نہیں سمجھتا۔ مشترکہ عبادت کی کوئی نہ کوئی صورت اور اس کے لئے کسی مقام کا ہونا بنی نوعِ انسان کی ضروریات میں سے ہے۔

میں یہ سطور ایک جوشیلے ہندو دوست کو جواب کے طور پر لکھ رہا ہوں، جس نے مہذب طریقے سے میری مذمت کی ہے ”اب آپ نے ’کلمہ‘ کو آشرم میں جگہ دیدی ہے۔ ہندو ازم کو ختم کرنے کے لئے اور کیا کچھ کرنا باقی ہے؟“

مجھے یقین ہے کہ میرے ہندو ازم کو اور آشرم کے دُوسرے ہندوؤں کے ہندو

ازم کو اس سے تقویت پہنچتی ہے۔ ہمارے اندر تمام مذاہب کے لئے مساوی احترام کا جذبہ ہونا چاہئے۔ بادشاہ خاں جب بھی یہاں آتے ہیں، وہ خوشی سے عبادت میں شریک ہوتے ہیں۔ جس دھن میں رامائن گائی جاتی ہے وہ اسے پسند کرتے ہیں اور گیتا کو دھیان سے سنتے ہیں۔ اس سے اسلام میں ان کا عقیدہ کمزور نہیں ہوا۔ تب میں اسی احترام کے جذبہ سے قرآن کیوں نہیں سن سکتا۔؟

رام کے صرف ایک نہیں ہزار نام ہیں۔ بلکہ ان گنت ہیں۔ اسے ہم چاہے اللہ کہیں، خدا کہیں، رحیم، رزاق کہیں، یا کسی بھی نام سے پکاریں جو اس کی بندگی کرنے والے کے دل سے نکلا ہو، اس کی ذات وہی کچھ رہتی ہے۔

میرا یقین ہے کہ پرارتھنا مذہب کی جان ہے۔ اس لئے پرارتھنا کسی انسان کی زندگی کا سہارا ہونا چاہئے کیونکہ مذہب کے بغیر کوئی بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ کچھ لوگ اپنی عقل کے زعم میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ مذہب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی انسان یہ کہے کہ وہ سانس تو لیتا ہے لیکن اس کی ناک نہیں ہے۔

پرارتھنا کرنے والے انسان کے اندر شانتی ہوگی اور تمام دنیا کے ساتھ اس کا رشتہ شانتی کا ہوگا۔ جو انسان پرارتھنا کے جذبے سے خالی ہو کر دنیا کے کام کرتا ہے، وہ خود دکھ اٹھاتا ہے اور دنیا کو بھی دکھی کرتا ہے۔ اس لئے اس بات سے قطع نظر کہ پرارتھنا کا اثر موت کے بعد کے حالات پر کیا ہوتا ہے، پرارتھنا انسان کے لئے اس دنیا میں بہت قدر و قیمت کی حامل ہے۔ روزمرہ کے کاموں میں ایک ترتیب، اطمینان اور شانتی قائم رکھنے کا واحد ذریعہ پرارتھنا ہی ہے۔

میں اس بات کو مانتا ہوں کہ اگر کسی شخص کو ہر وقت یہ احساس ہے کہ خدا

اس کی ذات میں موجود ہے تو اس کے لئے پرارتھنا کے لئے کوئی علیحدہ وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کے لئے یہ بات ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ دنیاوی جھمیلوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ ان کے لئے اپنے ذہن کو کچھ وقت کے لئے، چاہے یہ ہر روز کچھ لمحوں کے لئے ہی ہو، دنیاوی جھمیلوں سے الگ تھلگ رکھنے کی مشق انتہائی مفید ثابت ہوگی۔ اس طرح خدا کی ذات سے خاموش رابطہ قائم کرنے سے انہیں دنیاوی ہلچل کے درمیان شانتی محسوس کرنے غصّے پر قابو پانے اور اپنے اندر صبر کی خوبی پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں وہ کوئی افسانہ نہیں۔ میں نے کوئی فرضی نقشہ نہیں کھینچا۔ میں نے ان لوگوں کی شہادتوں کو قلمبند کیا ہے جنہوں نے پرارتھنا کی مدد سے اپنی ترقی کی راہ میں حائل ہونے کی ہر رکاوٹ پر غلبہ پایا ہے۔ اور میں نے اس میں اپنی اس حقیر سی شہادت کو بھی شامل کیا ہے کہ مجھے زندگی کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا زیادہ احساس ہو رہا ہے کہ میری کامیابی کس حد تک میرے عقیدے اور پرارتھنا کی مرہون منت ہے اور یہ دونوں چیزیں میرے لئے ایک ہی ہیں۔ میں ایک ایسے تجربے کا ذکر کر رہا ہوں، جو چند گھنٹوں، دنوں یا ہفتوں کا نہیں، بلکہ مسلسل چالیس برس کا ہے۔ مجھے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا، انتہائی تاریکی میں سے گذرنا پڑا، ہمت توڑنے والے اور احتیاط سے کام کرنے کے بارے میں مشورے بھی میرے کانوں میں پڑے اور تکبّر نے نہایت ہی لطیف پیرائے میں مجھ پر حملے کئے۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں تھوڑا بہت عقیدہ باقی ہے مگر اتنا بھرپور نہیں ہے جتنا کہ میری خواہش ہے۔

بالآخر اب تک ان میں سے ہر مشکل پر غالب آ تا رہا ہے۔

جب تک ہم اپنے آپ کو صفر کے برابر نہیں سمجھ لیتے ہم اپنے اندر موجود بدی پر فتح نہیں پا سکتے۔ حقیقی آزادی، جو حاصل کرنے کے قابل ہے، اسے پانے کی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر دیں۔ اس طرح جب کوئی انسان اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام مخلوق کا خدمتگار ہے۔ اس خدمت سے اسے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ جو خلق خدا کی خدمت کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا۔

اپنے دن کا آغاز پرارتھنا سے کرو۔ یہ پرارتھنا دل کی گہرائیوں سے نکلے اور شام تک اس کا اثر باقی رہے۔ دن کا اختتام بھی پرارتھنا سے ہی ہو، تاکہ آپ کی رات اطمینان سے گذرے اور اس میں ڈراؤنے خواب مخل نہ ہوں۔ پرارتھنا کی ظاہری صورت کے بارے میں تشویش نہ کیجئے۔ اس کی ظاہری شکل وصورت کچھ بھی ہو، مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس کی بدولت خدا کی ذات سے ہمارا رابطہ قائم ہو جائے۔ پرارتھنا کسی شکل میں بھی کی جائے، لیکن جب ہماری زبان سے پرارتھنا کے الفاظ نکل رہے ہوں، ہماری روح کو کہیں اور بھٹکتے نہیں رہنا چاہیئے۔

اپنی مرضی سے اپنے اوپر جو پابندی عائد کی جائے، اسے مجبوری نہیں کہا جا سکتا۔ جو انسان پابندی سے آزاد رہنے یعنی عیاشی کا راستہ منتخب کرتا ہے وہ ہوس کا غلام بن جاتا ہے۔ جبکہ وہ انسان جو کسی قاعدے کا پابند رہتا ہے۔ وہ درحقیقت آزاد ہو جاتا ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں جن میں سورج، چاند اور ستارے شامل ہیں۔ ایک قاعدے کے پابند ہیں. اگر ان قواعد کی پابندی نہ ہو تو دنیا ایک لمحے کے لئے بھی چل نہیں سکے گی۔ اگر آپ کسی ضابطے میں نہیں رہیں گے تو آپ کی زندگی برباد ہو جائے گی. اور روحانی ضابطے کے لئے پرارتھنا ایک لازمی عمل ہے۔ ضبط اور قاعدے کی پابندی ہی، ہمیں ایک

وحشی انسان سے ممتاز بناتی ہے۔ اگر ہم سر اونچا کر کے چلنے والے انسان ہیں چوپائے نہیں ہیں تو ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیئے اور ضابطے میں رہتے ہوئے رضاکارانہ طور پر کچھ پابندیاں قبول کرنی چاہیئں۔

سوال: ہمارے نوجوانوں کو یہ مشکل درپیش ہے کہ سائنس اور جدید فلسفے کے مطالعہ کے نتیجے میں ان کا اعتقاد ختم ہو گیا ہے اور وہ بے عقیدگی کی آگ میں جل رہے ہیں؛

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوان عقیدے کو ایک روحانی تجربے کی بجائے عقل و دانش کی کوشش کا نتیجہ سمجھنے لگے ہیں۔ عقل زندگی کی جدوجہد میں ایک حد تک ہی ہماری راہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن نازک لمحوں میں ہماری رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اعتقاد عقل سے بالاتر ہے۔ جب افق پر بالکل تاریکی چھائی ہوتی ہے اور عقل انسانی شکست کھا جاتی ہے، تب ہمارا اعتقاد پوری آب و تاب سے چمکتا ہے اور ہماری مدد کو آتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو ایسے ہی اعتماد کی ضرورت ہے اور یہ ہمیں اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی عقل پر اکڑنا بالکل ترک کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو بالکل خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے

عقل سے لامحدود بلندیوں پر کوئی ایسی چیز ہے جو ہم پر اور ان پر بھی جن کے ذہن میں شکوک موجود ہیں حکومت کرتی ہے۔ ان کے شکوک و شبہات اور ان کا فلسفہ ان کی زندگی کے نازک لمحات میں ان کی مدد نہیں کرتے۔ انہیں اس سے کسی بہتر چیز کی ضرورت ہے۔ جو ان کی ذات سے باہر اور انہیں سہارا دے سکے۔ اس لئے اگر کوئی شخص میرے سامنے کوئی معمہ لے کر آئے تو میں اسے یہی جواب دیتا ہوں کہ آپ تب تک خدا یا پرارتھنا کا مطلب نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ اپنے آپ کو صفر کے برابر نہیں سمجھتے۔ آپ میں اس قدر انکساری

ہونی چاہیئے کہ آپ اپنی عظمت اور انتہائی ذہانت کے باوجود آپ اپنے آپ کو کائنات کا ایک ذرہ سمجھیں۔ زندگی کی تمام چیزوں کو محض عقل کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرنا کافی نہیں۔ روحانی تصور عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ اور اسی سے انسان کو اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ امیروں کی زندگی میں کئی نازک لمحات آتے ہیں۔ اگرچہ انہیں کسی ایسی چیز کی کمی نہیں ہوتی جسے پیسے سے خریدا جا سکتا ہے۔ اور جو محبت سے مل سکتی ہے۔ لیکن وہ زندگی کے بعض مواقع پر اپنے آپ کو پریشان کن حالات میں پاتے ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر ہمیں خدا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور خدا کا تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے جو زندگی میں ہر قدم پر رہنمائی کر رہا ہے۔ یہی پرارتھنا ہے۔

سیاسی افق پر مایوسی مجھے گھور گھور کر دیکھتی رہی ہے لیکن میں نے اپنا ذہنی سکون کبھی نہیں کھویا۔ بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ لوگوں کو میرے ذہنی سکون کو دیکھ کر حسد ہوتا ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اطمینان قلب پرارتھنا سے حاصل ہوتا ہے۔ میں کوئی عالم نہیں ہوں لیکن میں بڑے عجز سے پرارتھنا کرنے والا انسان ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔

میں نے اپنی عملی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ہر انسان اپنی کوشش سے یہ پتہ چلا سکتا ہے کہ روزمرہ کی پرارتھنا سے وہ اپنی زندگی میں کسی نئی چیز کا اضافہ کر سکتا ہے۔ جس سے کوئی اور چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۵۔ غریبوں کا والی

غریبوں کا والی اُن لاکھوں ناموں میں سے ایک ہے جن سے انسان اس خدا کو یاد کرتا ہے جس کا کوئی نام نہیں، جس تک عقل انسانی کی رسائی نہیں دردِرنارائن کا مطلب غریبوں کا خدا ہے۔ وہ خدا جو غریبوں کے دل میں رہتا ہے۔

میں اپنے ملک کے عوام کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں تمام دن ان کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ مجھے ہر وقت انہی کا دھیان رہتا ہے۔ کیونکہ میں اس کے سوا اور کسی خدا کو تسلیم نہیں کرتا جو کہ کروڑوں بے زبان انسانوں کے دل میں موجود ہو۔ وہ اس کی موجودگی کو نہیں پہچانتے لیکن میں پہچانتا ہوں۔ اور میں اس خدا کو پرستش کرتا ہوں جو سچائی ہے۔ اور اس سچائی کی جو خدا ہے۔ میں ان کروڑوں انسانوں کی خدمت کے ذریعے اس خدا کی پرستش کرتا ہوں۔

بھوکے اور بیکار لوگوں کے لئے خدا کی وہی شکل قابل قبول ہو سکتی ہے جو روزگار، اجرت اور خوراک کی صورت میں ان کے سامنے جلوہ گر ہو۔

ہمیں تب تک پیٹ بھر کر کھانا کھاتے یا آرام کرنے میں شرم محسوس کرنی چاہیئے جب تک کہ ایک بھی مرد یا عورت جو کام کرنے کے قابل ہے روزگار یا

خوراک سے محروم ہے۔

ذرا سوچئے کہ یہ کتنی دردناک بات ہے کہ ۳۰ کروڑ انسانوں کو روزگار میسر نہ ہو اور ہر روز لاکھوں انسان روزگار نہ ملنے کی وجہ سے جذبہ خودداری سے محروم ہو رہے ہوں اور خدا کی ذات پر ان کا اعتقاد ختم ہو رہا ہوں۔ لاکھوں بھوکے انسانوں کے سامنے جن کی آنکھوں میں چمک نہیں اور جن کا خدا ان کی روٹی ہی ہے، خدا کا پیغام پیش کرنا بالکل بے کار ہے۔ میں ان لوگوں کے پاس خدا کا پیغام تبھی لے جا سکتا ہوں جب میں ان کو یہ پیغام بھی دے سکوں کہ انہیں عزت سے کام کرنے کا موقعہ ملے گا۔ ایک اچھے ناشتے کے بعد ایک اچھے کھانے کی توقع میں بیٹھے ہوئے خدا کی باتیں کرنا اور بات ہے لیکن میں ان لاکھوں لوگوں کے سامنے خدا کی باتیں کیسے کر سکتا ہوں جنہیں دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا؟ ان کے نزدیک دو وقت کا کھانا خدا کی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

غریبوں کے لئے روٹی ہی روحانیت ہے۔ ان کے ساتھ جدید ترقی کی باتیں کرنا بے معنی ہیں۔ ان کے سامنے خدا کا نام لینے سے ان کی توہین ہوتی ہے۔ اگر آپ اور میں ان سے خدا کی باتیں کریں گے تو وہ ہمیں اپنا دوست نہیں سمجھیں گے۔ اگر وہ کسی خدا کو جانتے ہیں تو وہ ظلم، انتقام اور بے رحمی کا خدا ہے۔

کئی سال پہلے میں نے ایک نظم پڑھی تھی جس میں کسانوں کو دنیا کا باپ کہا گیا ہے۔ اگر خدا رازق ہے تو کاشت کار اس کا ہاتھ ہے۔ کسان کا جو قرض ہمارے اوپر ہے اسے ادا کرنے کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں؟ ابھی تک تو ہم اس کے پسینے کی کمائی پر زندہ رہے ہیں۔ سنہری قاعدہ یہی ہے کہ جو چیز لاکھوں انسانوں کو میسّر نہیں ہم اسے لینے سے

مستقل مزاجی سے انکار کر دیں۔ لیکن انکار کرنے کی یہ طاقت ہمیں اچانک ہی حاصل نہیں ہو گی۔ پہلی ضروری شرط ایک ایسا ذہنی رجحان اختیار کرنا ہے جو ان اشیا یا سہولتوں کو حاصل کرنا نہیں چاہتا جن سے لاکھوں انسان محروم ہیں۔ اور اس کے فوراً بعد دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہم اس رجحان کے مطابق جلد از جلد اپنی زندگی کو ایک نئی ترتیب دیں۔

اگر دولت پر قبضے اور اس سے حاصل ہونے والی طاقت کو رضا کارانہ طور پر ترک نہ کیا گیا اور اسے مشترکہ بہبود کے لئے مل کر استعمال میں نہ لایا گیا تو ایک نہ ایک دن خونی انقلاب کا رونما ہونا یقینی امر ہے۔

آج زبردست معاشی عدم مساوات دیکھنے میں آتی ہے۔ معاشی مساوات سوشلزم کی بنیاد ہے۔ موجودہ غیر منصفانہ عدم مساوات کی موجودگی میں جبکہ کچھ لوگ دولت سے کھیل رہے ہیں۔ اور عوام کو پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں ملتا، رام راجیہ وجود میں نہیں آسکتا۔

ہندوستان کی معاشی آزادی کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنی کوششوں سے ترقی کر سکے۔ اس نظام میں تمام مردوں اور عورتوں کو صرف ستر پوشی کے لئے ہی نہیں بلکہ تن ڈھانپنے کو کافی کپڑا اور کافی خوراک ملے جس میں دودھ اور مکھن بھی شامل ہو جو کہ آج کروڑوں انسانوں کو میسّر نہیں۔

میرے خیال میں ہندوستان کا اور تمام دنیا کا معاشی نظام ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے تحت کسی شخص کو کپڑے اور خوراک کی قلت محسوس نہ ہو، دوسرے الفاظ میں ہر شخص کو اتنا کام ملنا چاہئے کہ وہ دو وقت کا کھانا کھا سکے۔ اور عالمگیر پیمانے پر ایسا تبھی ممکن

ہو گا جب بنیادی ضروریات زندگی پیدا کرنے کے ذرائع پیداوار عوام کے کنٹرول میں ہوں، یہ چیزیں تمام لوگوں کو ایسے ہی میسّر آنی چاہئیں جیسا کہ ہوا اور پانی میسّر ہیں یا ہونے چاہئیں۔ انہیں ورکروں کی محنت کا فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ان پر کسی ملک، قوم یا گروہ کی اجارہ داری غیر منصفانہ ہو گی۔ آج ہمیں نہ صرف اس ملک میں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی جو افلاس و نکبت دکھائی دے رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سادہ اصول کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں معاشیات اور اخلاق کے درمیان کوئی واضح لکیر نہیں کھینچتا۔ ایسی معاشیات جس سے کسی فرد یا قوم کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہو، اخلاق کے منافی ہے اور اس لحاظ سے گناہ ہے۔ اسی طرح ایسی معاشیات جو ایک ملک کو دوسرے ملک کی لوٹ کھسوٹ کی اجازت دیتی ہے، وہ اخلاق کے منافی ہے۔

"تمام انسان برابر اور آزاد ہیں" اس قانون قدرت کو لفظی معنی کے لحاظ سے صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً ہر انسان عقل کے لحاظ سے برابر نہیں ہے۔ لیکن اگر ذہین افراد اپنی ذہانت کو دوسروں کی قیمت پر اپنی ترقی کے لئے نہیں بلکہ اپنے سے نچلی سطح کے لوگوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں تو وہ مساوات کے مندرجہ بالا اصول کی درستی کا صحیح ثبوت فراہم کریں گے۔

دولت جمع کرنے کا فن ایک گھٹیا اور قابل نفرت فن بن جاتا ہے اگر اس دولت کو مفید طریقے سے خرچ کا اعلیٰ فن اس کے ساتھ نہ ہو۔ حصول دولت کا مطلب گراوٹ، گناہ اور بدکرداری کو اختیار کرنا نہیں۔

آپ بے شک کروڑوں روپے کمائیے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیئے کہ یہ دولت

آپ کی نہیں، اس کے مالک عوام ہیں۔ اپنی جائز ضرورتوں کے لئے آپ کو جتنی دولت چاہیئے لے لیجئے۔ اور باقی ماندہ دولت کو سماج کے فائدے کے لئے خرچ کیجئے۔ اس سچائی پر ابھی تک عمل نہیں کیا گیا۔ لیکن دولت مند لوگ اس زمانہ میں بھی جبکہ سماجی زندگی پر بڑا دباؤ ہے، اس اصول پر عمل نہیں کریں گے۔ تو وہ اپنی دولت اور ہوس کے غلام رہیں گے۔ اور اس کے نتیجے میں ان لوگوں کے غلام بن جائیں گے جو ان پر غلبہ پالیں گے۔

میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ میرے نظریے کے مطابق سرمایہ اور محنت دونوں ساتھی ہیں اور انہیں ایک دوسرے کا معاون ہونا چاہیئے۔ ان میں ایک کنبے کے افراد کی طرح اتحاد اور یگانگت کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دار اپنے تحت کام کرنے والے محنت کش طبقے کی فلاح و بہبود کے امین ہیں اور اس لئے انہیں نہ صرف محنت کشوں کی مادّی فلاح و بہبود کا بلکہ ان کی اخلاقی بہبود کا خیال بھی رکھنا چاہیئے۔

غریبوں کی لوٹ کھسوٹ کو چند ایک کروڑ پتیوں کو تباہ و برباد کر کے نہیں روکا جا سکتا۔ بلکہ اسے ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ غریبوں کی جہالت کو دور کیا جائے۔ اور انہیں یہ تعلیم دی جائے کہ وہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں سے عدم تعاون کریں۔ اس طریقے سے لوٹ کھسوٹ کرنے والے افراد میں بھی تبدیلی آئے گی۔ میں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس طرح آخر کار دونوں برابر کے حصے دار بن جائیں گے۔ سرمایہ بذات خود بری چیز نہیں۔ بلکہ اس کا غلط استعمال بری چیز ہے۔ سرمایے کی ضرورت کسی نہ کسی شکل میں تو رہے گی ہی

میں چاہتا ہوں کہ تمام لوگوں کا ایک ہی درجہ یا مرتبہ ہو۔ ان تمام صدیوں میں محنت کش طبقہ الگ تھلگ رہا ہے اور اسے کم تر درجہ دے دیا گیا ہے۔ لفظ شودر کو

کم تر درجے سے منسوب کیا گیا ہے۔ میں ایک جولاہے، ایک کاشت کار اور ایک اسکول ماسٹر کے بیٹے کے درمیان کسی قسم کے امتیاز کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔

محنت کش کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ محنت بھی سرمایہ ہے۔ جوں ہی محنت کشوں کو مناسب تعلیم دی جائے گی، انہیں منظم کیا جائے گا اور وہ اپنی طاقت کو سمجھنے لگ جائیں گے تو سرمایہ انہیں کبھی دبا نہیں سکے گا۔ منظم اور سمجھدار محنت کش اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔ کمزور ہونے کی وجہ سے کسی فریق سے انتقام لینے کی قسم کھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں طاقتور بننے کی ضرورت ہے۔ مضبوط دل، سلجھے ہوئے دماغ اور کام کرنے کے لئے تیار ہاتھ تمام مصیبتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور تمام رکاوٹوں پر عبور پا سکتے ہیں

میں نہیں سمجھتا کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان کبھی قسم کے ٹکراؤ کی ضرورت ہے دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرمایہ دار محنت کشوں پر حکومت کرنے کا خیال نہ کریں۔ میرے خیال میں محنت کش بھی کارخانوں کے اتنے ہی مالک ہیں جتنا کہ اس کے حصہ دار، اور جب کارخانوں کے مالک اس بات کو سمجھ لیں گے کہ محنت کش بھی کارخانوں کے اتنے ہی مالک ہیں جتنا کہ وہ خود، تو اُن کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہو گا۔

عدم تشدد کے طریقے سے ہم سرمایہ داروں کو نہیں بلکہ سرمایہ داری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سرمایہ دار کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے مفاد کا محافظ سمجھے جن کی محنت پر وہ دولت کمانے اور اپنے سرمایہ سے میں اضافہ کرنے کے لئے انحصار رکھتا ہے۔ محنت کشوں کو بھی اس کی تبدیلیٔ قلب کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر سرمایہ طاقت ہے تو محنت بھی ایک قوت ہے۔ ان میں سے کسی بھی طاقت کو تعمیری کام

کے لئے یا تباہی و بربادی لانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دونو طاقتیں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ جوں ہی محنت کش کو اپنی طاقت کا احساس ہو جائے گا وہ سرمایہ دار کا غلام رہنے کی بجائے اس کا حصے دار بننے کی پوزیشن میں ہو جائے گا۔ اگر وہ واحد مالک بننے کی کوشش کرے گا تو اس کا یہ فعل سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ہی ہلاک کرتے کے مترادف ہو گا۔

موجودہ دور میں مشینوں کی ضرورت ہے۔ اور اس کی ضرورت باقی رہے گی۔ مگر مشینوں کو غیر ضروری حد تک مزدوروں کی جگہ لینے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔

ایک اوسط درجے کی ذہانت کا مالک ہونے کی حیثیت سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان صنعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں صنعتی ترقی کا مخالف نہیں ہوں لیکن مجھے مشینی صنعت کے نفاذ پہ بہت تشویش ہے۔ مشین بہت تیزی سے کام کرتی ہے اور ایک ایسا معاشی نظام لاتی ہے جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے برے اثرات اس کے اچھے اثرات سے زیادہ ہیں۔ میں اپنے ملک کے کروڑوں بے زبان انسانوں کو صحت مند، خوش اور روحانی طور پر ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس مقصد کے لئے ہمیں مشین کی ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں بہت سے آدمی بے روزگار ہیں۔ لیکن بعد میں اگر ہمیں مشینوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہم یقیناً انہیں استعمال کریں گے۔ اگر ہم صنعتی ترقی چاہتے ہیں۔ تو ہم کو محنتی بھی بننا چاہیئے۔ اپنے اوپر پہلے سے زیادہ اعتماد کرنا سیکھیں۔ تب ہمیں دوسرے لوگوں کی زیادہ پیروی نہیں کرنی پڑے گی۔ جب ضرورت پڑی اور ضرورت محسوس ہوئی تو ہم مشین استعمال کریں گے۔ ایک بار ہم

اپنی زندگی میں اہنسا کے طریقے کو اپنا لیں۔ تو ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ مشین پر ہمارا کنٹرول کیسے رہ سکتا ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ مشین بنی نوع انسان کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتی ہے تو بھی بعض مخصوص علاقوں میں پیداوار پر توجہ مرکوز رہے گی جس کے نتیجے میں آپ کو پیداوار کی تقسیم کے عمل کو ضابطے میں رکھنے کی کارروائی کرنی پڑے گی۔ اگر پیداوار اور تقسیم دونوں متعلقہ علاقوں میں ضرورت کے مطابق ہوں تو تمام چیز خود بخود ضابطے میں رہے گی۔ اور دھوکے کا امکان کم ہو جائے اور سٹے بازی کا امکان نہیں رہے گا۔ جب پیداوار اور کھپت دونوں کی نوعیت مقامی ہو جائے تو ہر قیمت پر اور غیر محدود پیمانے پر پیداوار بڑھانے کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ تب وہ تمام مشکلیں اور مسائل جو ہمارے موجودہ معاشی نظام میں ہمیں درپیش ہیں ختم ہو جائیں گے۔ یقیناً وسیع پیمانے پر پیداوار ہونی چاہیئے۔ لیکن وسیع پیمانے پر پیداوار (انفرادی بنیادوں پر) لوگوں کے گھروں میں کی جانی چاہیئے۔ اگر آپ انفرادی پیداوار کی مقدار کو لاکھوں سے ضرب دیں تو کیا یہ ایک زبردست وسیع پیمانے پر پیداوار کے مساوی نہیں ہو جائے گی؟ وسیع پیمانے پر پیداوار سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ کم سے کم افراد بہت ہی پیچیدہ مشینوں کی مدد سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کریں۔ لیکن میری مشین پیچیدہ نہیں بلکہ ابتدائی نوعیت کی ہوگی جس سے لاکھوں افراد کے گھروں میں کام لیا جا سکے۔

سوال: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مشینوں کے مخالف اس لئے اور اس صورت میں ہیں جب یہ پیداوار اور تقسیم کے عمل کو چند ہاتھوں میں مرکوز کر دے؟

جواب: یہ درست ہے۔ مجھے اجارہ داری اور خاص مراعات سے نفرت

ہے۔ جس چیز کا حصہ عوام تک نہ پہنچ سکے وہ میرے نزدیک ناجائز ہے۔ بس بات اتنی ہی ہے۔

سوال: کیا آپ ہندوستان کو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک نہیں بنائیں گے؟

جواب: یقیناً بناؤں گا۔ لیکن ان معنوں میں جنہیں میں ٹھیک سمجھتا ہوں۔ میں دیہات میں ایک مختلف ڈھنگ سے صنعتی ترقی لا رہا ہوں۔

میں سائنس کی ہر اس بات کی جس سے سب کو فائدہ پہنچے قدر کرتا ہوں۔

ہر اس مشین کی، جس سے ہر فرد کو فائدہ پہنچتا ہو، سماج میں جگہ ہے۔ بنی نوع انسان کے متمدن کنبے میں محنت کش طبقے کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

سادہ اوزاروں اور ایسی مشینوں کو جو افراد کی محنت کے بوجھ کو اور لاکھوں گھرانوں کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہیں۔ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں مشینوں کے خلاف نہیں بلکہ صنعتوں میں مشینوں کی تنصیب کا جو جنون ہے اس کے خلاف ہوں۔ یہ جنون ایسی مشینوں کے استعمال کے لئے ہے جس کی مدد سے محنت کشوں کی تھوڑی تعداد سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہزاروں افراد بے روزگار ہو کر بھوکے مرنے لگتے ہیں۔ میں وقت اور محنت کی بچت چاہتا ہوں لیکن تمام بنی نوع انسان کے لئے، نہ کہ اس کے ایک حصے کے لئے۔ میں چاہتا ہوں کہ دولت چند ایک ہاتھوں میں نہیں بلکہ تمام لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ اس وقت مشین محض چند لوگوں کو کروڑوں لوگوں کی پیٹھ پر سوار ہونے میں مدد دے رہی ہے۔ اس کی پشت پر محنت کشوں کی محنت میں کمی کرنے کا نیک جذبہ نہیں بلکہ لالچ کا جذبہ کام کر رہا ہے۔

میں اپنی تمام قوت سے اس قسم کے حالات کے خلاف لڑ رہا ہوں۔
سب سے زیادہ توجہ کا مستحق انسان ہے۔ مشین کو انسانی ہاتھوں کو بیکار کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔
سوال: تب آپ مشینوں کے خلاف نہیں بلکہ مشینی نظام سے پیدا ہونے والے برائیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں جس کی مثالیں روزمرہ کی زندگی میں ملتی ہیں۔
جواب: اس کا جواب میں بلا جھجک 'ہاں' میں دوں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ سب سے پہلے سائنسی سچائی اور دریافتوں کو لالچ کے خیال سے استعمال میں نہیں لایا جانا چاہیئے۔ اس صورت میں محنت کشوں کو ضرورت سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا اور مشین رکاوٹ پیدا کرنے کی بجائے مددگار ثابت ہوگی۔ میرا مقصد مشینوں کو ختم کرنا نہیں بلکہ اس کے عمل دخل کو محدود کرنا ہے۔ منطقی پہلو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بجلی سے چلنے والی تمام پیچیدہ مشینری ختم ہو جانی چاہیئے۔
شاید یہ ختم ہی ہو جائے لیکن میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کا شمار چند ایک دریافتوں میں مفید ہوتا ہے اور یہ خود ایک روحانی کیفیت کی حامل ہے۔ سنگر نے اپنی بیوی کو ہاتھوں سے کپڑے سیتے ہوئے اور ان کی مرمت کے لئے سخت مشقت کرتے ہوئے دیکھا اور محض بیوی کی محبت کے جذبے سے متحرک ہو کر اس نے سلائی مشین دریافت کی تاکہ اس کی بیوی کو غیر ضروری مشقت نہ کرنی پڑے لیکن اس طرح اس نے نہ صرف اپنی بیوی کی محنت کے بوجھ کو بلکہ ہر اس شخص کی محنت کے

بوجھ کو ہلکا کیا جو کپڑے سینے کی مشین خرید سکتا تھا۔

سوال: لیکن اس حالت میں ایک کارخانہ ہونا چاہیئے۔ جہاں یہ سلائی مشین تیار کی جاسکے۔ اور اس کارخانہ میں بجلی سے چلنے والے عام نوعیت کی مشینری کا ہونا ضروری ہے۔

جواب: درست ہے۔ لیکن میں اس حد تک سوشلسٹ ضرور ہوں کہ بس یہ کہہ سکوں کہ اس قسم کے کارخانوں کو قومی ملکیت کا قرار دیا جانا چاہیئے یا ان پر ریاست کا کنٹرول ہونا چاہیئے۔ انہیں نہایت پرکشش اور مثالی حالات کے تحت کام کرنا چاہیئے نفع کمانے کے لئے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے۔ لالچ کی جگہ محبت کو لے لینی چاہیئے۔

میں تو محنت کشوں کی حالت میں تبدیلی چاہتا ہوں۔ دولت حاصل کرنے کی یہ مجنونانہ دوڑ ختم ہونی چاہیئے اور محنت کشوں کو اس امر کا یقین دلایا جانا چاہیئے کہ انہیں نہ صرف زندہ رہنے کے لئے اجرت ملے گی بلکہ ان کا روزمرہ کا کام بھی ایسا نہیں ہو گا جسے وہ بیگار سمجھ کر کریں۔ ان حالات میں مشین اسے چلانے والے انسان کے لئے اتنی ہی مددگار ثابت ہو گی جتنی کہ ریاست کے لئے یا اس آدمی کے لئے جو اس کا مالک ہوگا موجودہ مجنونانہ دوڑ ختم ہو جائے گی اور محنت کش جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، پرکشش اور مثالی حالات کے تحت کام کریں گے۔ میرے ذہن میں استثنا کی یہ ایک مثال ہے۔ سیونگ مشین کی دریافت کے پیچھے محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ سب سے زیادہ توجہ کا مستحق انسان ہے۔ انفرادی محنت کی بچت مقصد ہونا چاہیئے۔ جیسے پانے کے لئے ہم انسانی جذبہ سے متحرک ہوں نہ لالچ کے جذبے سے۔ لالچ کی جگہ محبت کو لے آیئے

پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

سرمایہ اپنے آپ کو بڑھانے کے لئے چند لوگوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اگر محنت دانشمندی سے فائدہ اٹھایا جائے تو کروڑوں انسانوں کی مجموعی محنت خود بخود کروڑوں کی دولت میں اضافے کا موجب بنے گی۔

لیکن اچھا ہو یا برا، آخر ہندوستان انہی معنوں میں کیوں صنعتی ملک بنے جن معنوں میں کہ مغربی ممالک بنے ہیں؟ مغربی تہذیب شہری تہذیب ہے۔ انگلستان یا اٹلی ایسے چھوٹے ملک اپنے نظام کو شہری رنگت دے سکتے ہیں۔ امریکہ ایسا بڑا ملک بھی، جس کی آبادی کم ہے، شاید ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایک بڑا ملک، جس کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ جو ان قدیم دیہی روایات کا حامل ہے جو اب تک وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی آئی ہیں۔ اسے مغربی طریقے کی نقل کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیئے۔ مخصوص حالات کے تحت ایک قوم کے لئے جو چیز درست ہے، وہ ضروری نہیں کہ مختلف حالات کے تحت کسی دوسری قوم کے لئے بھی فائدہ مند ہو۔ اکثر ایک آدمی کو جو خوراک راس آتی ہے وہ دوسرے کے لئے زہر ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی ملک کے جغرافیائی حالات کا اس ملک کے تمدن کی تشکیل میں بڑا دخل ہوتا ہے قطبی خطے میں رہنے والے کسی شخص کے لئے کھال کا کوٹ ایک ضروری چیز ہو گا لیکن استوائی خطے میں رہنے والا کوئی شخص اسے ہرگز پہن نہیں سکتا۔

جب کسی کام کو کرنے کے لئے افراد کی کمی ہو تو مشینوں سے کام لینا اچھا ہو گا لیکن افراد کی تعداد کام کے لئے مطلوبہ تعداد سے زیادہ ہو، جیسا کہ ہندوستان میں ہے۔ تو یہ ایک برائی بن جائے گی۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ ہم اپنے ملک کے دیہات کے کروڑوں

لوگوں کے لئے فرصت کے اوقات کیونکر پیدا کریں بلکہ مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ جو وقت اس وقت بیکار گنوار ہے ہیں، اس سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔ ان کا جتنا وقت ضائع ہو جاتا ہے وہ ایک سال میں چھ مہینوں کے ایام کے مساوی ہے۔

خدا نہ کرے کہ ہندوستان کبھی صنعتی ملک بننے کے لئے مغربی ملکوں کی نقل کرے۔ آج ایک چھوٹے سے جزیرے انگلینڈ کا اقتصادی سامراج دنیا کو زنجیر میں باندھے ہوئے ہیں۔ اگر ۳۰ کروڑ افراد کی تمام قوم نے اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا یہی راستہ اپنا لیا، تو وہ دنیا کو ایسا کھا جائے گی جیسے ٹڈی دل فصلوں کو برباد کرتا ہے۔

ہندوستان کے سات لاکھ دیہات ہیں جن میں اس کی آبادی کا ۹۰ فیصد حصہ آباد ہے۔ قومی منصوبہ بندی کے موضوع کے بارے میں میرے خیالات مروجہ خیالات سے مختلف ہیں میں صنعتی لائنوں پر منصوبہ بندی نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے دیہات صنعتی دوڑ سے بچے رہیں۔ پنڈت نہرو ملک کو صنعتی بنانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر صنعتوں کو سماج کی ملکیت قرار دیا جائے تو یہ سرمایہ داری کی بدعتوں سے محفوظ رہے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ بدعتیں خود صنعتی پھیلاؤ کا جزو ہیں اور سماجی کنٹرول کسی صورت میں بھی ان بدعتوں کو ختم نہیں کر سکتا۔

میں نہیں سمجھتا کہ صنعتی بننا کسی بھی ملک کے لئے ضروری ہے۔ اور ہندوستان کے لئے یہ اور بھی کم ضروری ہے۔ درحقیقت میرا یقین یہ ہے کہ آزاد ہندوستان اس مصیبت زدہ دنیا کے تئیں اپنی ذمہ داری ایک سادہ اور پاک زندگی اختیار کر کے ہی نبھا سکتا ہے! اور اس قسم کی زندگی وہ دنیا کے ساتھ امن قائم رکھ اور لاکھوں گھروں میں چھوٹی صنعتوں کو ترقی دے کر ہی کر سکتا ہے۔ بلند خیالی دولت کی پرستش کے جذبہ کے تحت تیز رفتار پیچیدہ زندگی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ زندگی کی تمکنت برقرار رکھنا صرف اسی حالت میں ممکن ہوگا،

جب ہم نیکی کی زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیں۔

اس کے ساتھ ہی میں سمجھتا ہوں کہ کچھ کلیدی صنعتوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ میں مسلح طاقت کے بل بوتے پر یا آرام کرسیوں پر بیٹھ کر بحث کر کے سوشلزم لانے میں یقین نہیں رکھتا۔ بلکہ میں وسیع پیمانے پر لوگوں کے ہم خیال ہونے کا انتظار کئے بغیر میں اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرنے میں یقین رکھتا ہوں۔ لہٰذا کلیدی صنعتوں کی وضاحت کے بغیر میں ان تمام حالتوں میں سرکاری کنٹرول کی حمایت کروں گا۔ جہاں لوگوں کو مل کر کام کرنا پڑتا ہے ان کی محنت کی پیداوار کی ملکیت، خواہ یہ محنت ہنرمندانہ ہو یا غیر ہنرمندانہ، ریاست کی معرفت انہی کے ہاتھوں میں رہے گی۔ لیکن چونکہ میں اس قسم کی حالت کا تصور صرف عدم تشدد کی بنیادوں پر ہی کر سکتا ہوں، اس لئے میں دولت مند طبقے سے اس کی دولت زبردستی نہیں چھینوں گا بلکہ ریاست کی ملکیت کو وجود میں لانے کے عمل میں ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ سماج میں کوئی بھی اچھوت نہیں۔ خواہ وہ لکھپتی ہو یا دیوالیہ ہو، دونوں ایک ہی مرض کی علامتیں ہیں۔ ہم سب انسان ہی تو ہیں۔

اشتراکیت ایک خوبصورت لفظ ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کے تحت سماج کے تمام افراد کو مساوی درجہ حاصل ہوگا۔ اور کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوگا۔ جسم انسانی میں ہم سر کو اس لئے بڑا نہیں سمجھتے کہ وہ جسم کی چوٹی ہے اور نہ ہی پاؤں کے تلوؤں کو اس لئے نیچا سمجھتے ہیں کہ وہ زمین سے چھوتے ہیں۔ جس طرح جسم کے تمام اعضا مساوی درجہ رکھتے ہیں اسی طرح سماج کے تمام افراد کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ یہی اشتراکیت ہے۔

ایک راجکمار اور کسان، ایک امیر اور غریب، اور ایک آجر اور ملازم، سبھی برابر ہیں۔ اشتراکیت میں مذہبی نقطہ نظر سے دوئی کی گنجائش نہیں۔ اس میں ایکتا ہی ہو سکتی ہے۔

اگر تمام دنیا کے سماج پر نظر دوڑائیں تو ہمیں دوئی ہی نہیں بلکہ کثیر اختلافات دکھائی دیں گے ایکتا کہیں نہیں دکھائی دے گی۔ ایکتا کے بارے میں میرے نظریے کے مطابق کثیر مقاصد کے حصول کے لئے عمل میں بھی مکمل ایکتا موجود ہے۔

اس حالت تک پہنچنے کے لئے ہمیں صورت حالات پر فلسفیانہ نظر ڈالنے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب تک تمام لوگ اشتراکیت کے ہم نوا نہ ہو جائیں تب تک ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ زندگی میں تبدیلی لائے بغیر ہم تقریریں تو کر سکتے یا پارٹیاں تو بنا سکتے ہیں اور باز کی طرح جب شکار ہاتھ لگے تو اس پر جھپٹ بھی سکتے ہیں لیکن یہ اشتراکیت نہیں ہوگی ہم جتنا اسے شکار کی مانند سمجھیں گے، یہ ہم سے اتنا ہی دور ہوتی جائے گی۔

اشتراکیت کا آغاز اس ایک شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو سب سے پہلے اس پر یقین لے آئے۔ اس ایک کے آگے کئی صفر لگ سکتے ہیں۔ پہلا صفر لگنے سے یہ تعداد دس تک پہنچ جائے اور اس کے بعد ہر صفر کے اضافہ سے تعداد میں دس گنا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ البتہ اگر آغاز ہی صفر سے ہوگا یعنی کوئی اس کام کو شروع ہی نہ کرے تو باقی کے آگے صفر لگنے سے بھی نتیجہ صفر کے برابر ہی رہے گا۔ اور یہ صفر لگانے کے لئے جو وقت اور کاغذ صرف ہوگا وہ بے کار جائے گا۔

اشتراکیت بلّور کی مانند شفّاف ہے۔ اس لئے اسے پانے کے لئے بالکل پاک طریقے اپنانے کی ضرورت ہے۔ ناپاک طریقے اختیار کرنے کا انجام بھی ناپاک ہوگا۔ اس لئے ایک راجکمار اور ایک کسان کو مساوی درجہ راجکمار کا سر کاٹنے سے حاصل نہیں ہوگا اور نہ کاٹ پیٹ کے عمل سے ایک آجر اور ملازم ایک سطح پر آسکتے ہیں۔ ہم سچائی تک جھوٹ کے راستے سے نہیں پہنچ سکتے۔ سچا عمل ہی ہمیں سچائی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ کیا

عدم تشدد اور سچائی دو چیزیں نہیں ہیں؟ اس کا جواب ہے "ہرگز نہیں"۔ عدم تشدد سچائی میں پنہاں ہیں اور سچائی عدم تشدد میں۔ اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ ایک ہی سکّے کی دو رخ ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سکّے کی عبارت کو کسی طرف سے پڑھیئے۔ الفاظ کے ہجے الگ ہو سکتے ہیں لیکن ان کے ذریعے ظاہر کی گئی قیمت ایک ہی ہو گی۔ ایسی اچھی حالت تک پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے دل بالکل صاف ہوں۔ اگر آپ کا دل صاف نہیں ہو گا تو آپ کے اندر سچائی نہیں ہو گی۔ اور تشدد آپ کے اندر اپنا مقام پیدا کرے گا۔

اس لئے سچے، عدم تشدد پر کاربند اور صاف دل والے سوشلسٹ ہی ہندوستان اور دنیا میں ایک سوشلسٹ سماج وجود میں لا سکتے ہیں۔

مساوی تقسیم کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو قدرتی ضروریات کو پورا کرنے کا سامان میسر آئے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، مثال کے طور پر اگر کسی شخص کا ہاضمہ کمزور ہے اور اسے صرف ایک چوتھائی سیر آٹے کی ضرورت ہے اور کسی دوسرے شخص کو ایک سیر آٹے کی ضرورت ہے، تو دونوں کی ضرورت پوری ہونی چاہیئے۔ اس نظریے کو عمل میں لانے کے لئے تمام سماجی ڈھانچے کی از سر نو تعمیر کی ضرورت ہے۔ جس سماج کی بنیاد عدم تشدد پر ہو، اس کا کوئی اور آدرش ہو ہی نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس نشانے تک نہ پہنچ سکیں لیکن ہمیں اس کو ذہن میں رکھنا چاہیئے اور اس کے قریب پہنچنے کی مسلسل کوشش کرنی چاہیئے۔ ہم جس حد تک اپنی منزل کی طرف آگے بڑھیں گے، ہمیں اتنی ہی زیادہ مسرت اور اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ اور اسی حد تک ہم عدم تشدد پر مبنی سماج کو وجود میں لانے کے لئے اپنا پارٹ ادا کریں گے۔

اب ہم اس بات پر غور کریں کہ عدم تشدد کے ذریعے مساوی تقسیم کو کیسے عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے اس نظریے کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیا ہے، اس کے لئے پہلا ضروری کام

یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں مطلوبہ تبدیلی لائے۔ ایسا شخص اپنی ضروریات کو بالکل ضروری حد تک کم کر دے گا اور ہندوستان کی غریبی کو ذہن میں رکھے گا۔ وہ ایمانداری سے پیسہ کمائے گا اسے سٹے بازی کی خواہش نہیں ہو گی اور اس کا رہن سہن اس کے طرزِ فکر کے مطابق ہو گا وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے اوپر خود جائز پابندی قبول کرے گا۔ جب وہ ان تمام باتوں پر جن پر عمل کرنا ممکن ہے، اپنی زندگی میں عمل کرنا شروع کر دے گا۔ تب وہ اپنی نظریے کا پرچار اپنے پڑوسیوں اور ساتھیوں میں بھی کر سکے گا۔

مساوی تقسیم کے اس اصول کی تہ میں یہ اصول کارفرما ہونا چاہئے کہ دولت مند افراد کے پاس جو فاضل دولت ہے، وہ اس کے امین ہیں۔ کیونکہ اس اصول کے مطابق انہیں اپنے پڑوسی کی نسبت ایک روپیہ بھی زیادہ اپنے قبضے میں نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ بات عمل میں کیسے آسکتی ہے؟ کیا امیروں سے ان کی دولت چھین لی جائے؟

اس کے لئے ہمیں یقیناً تشدد کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جس سے سماج کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس طریقے سے سماج پہلے سے زیادہ غریب ہو جائے گا کیونکہ وہ اس شخص کی قابلیت سے استفادہ نہیں کر سکے گا۔ جو دولت جمع کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ اس لئے عدم تشدد کا راستہ ہی یقینا بہتر راستہ ہے۔ دولت مند شخص کی دولت اس کے پاس رہے گی لیکن اس میں سے وہ اتنی دولت اپنے لئے استعمال کرے گا جو اس کی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چاہئے۔ اور باقی ماندہ دولت اس کے پاس امانت کے طور پر رہے گی جسے سماج کے فائدے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس دلیل میں یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ جو شخص بھی دولت کا امین ہو گا وہ ایمانداری سے کام لے گا۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود دولت مند افراد صحیح معنوں میں

غریبوں کا سرپرست بننا منظور نہیں کریں گے اور غریب لوگ زیادہ سے زیادہ دبتے جائیں
اور بھوکے مریں   تب کیا ہوگا؟ اس کا حل تلاش کرنے کے لئے میں نے عدم تشدد، عدم
تعاون اور سول نافرمانی کے طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جو کہ بالکل درست طریقے ہیں۔ دولت مند
غریبوں کے تعاون کے بغیر دولت اکٹھی نہیں کرسکتے۔ اگر غریبوں کو اس بات کا علم ہو جائے تو وہ
طاقتور بن جائیں گے اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ عدم تشدد کے ذریعے اس عدم مساوات
سے کیونکر چھٹکارا پاسکتے ہیں جس کے نیچے دبے ہوئے وہ فاقہ کشی کے کنارے تک پہنچ گئے ہیں۔

مغربی ملکوں کے سوشلزم اور کمیونزم کی بنیاد کچھ ایسے نظریات پر رکھی گئی ہے جو ہمارے نظریات
سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے۔ میں
اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک انسان اور ایک وحشی کے درمیان
بنیادی فرق یہی ہے کہ اول الذکر اپنے اندر موجود روح کی آواز کو سنتا ہے اور ہوس سے اوپر اٹھ
سکتا ہے جو اس کے اور ایک وحشی، دونوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس طرح وہ خود غرضی
اور تشدد کو ترک کرسکتا ہے جو وحشیانہ فطرت کا جزو ہے۔ اور جن کا غیر فانی انسانی روح سے
کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ ہندوازم کا یہ بنیادی نظریہ ہے اور یہ سچائی برسوں کی ریاضت
کے بعد دریافت کی گئی۔ اسی لئے ہمارے درمیان ایسے سادھو سنت تو موجود ہیں جنہوں نے
روح کے رازوں کا پتہ لگانے کے لئے اپنے جسم ختم کردیئے لیکن مغربی ملکوں کی طرح ہمارے
درمیان کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے دنیا کے دور دراز یا بلند ترین خطوں کی
کھوج کے سلسلے میں اپنی جان دیدی ہو۔ اس لئے ہمارے سوشلزم یا کمیونزم کی بنیاد عدم
تشدد پر اور سرمایہ اور محنت کے، اور زمیندار اور کسان کے درمیان خوشگوار تعاون پر رکھی
جانی چاہیئے۔

میں ننگے انسان کو روزگار کی بجائے جس کی انہیں ضرورت ہے' کپڑے دے کر جن کی انہیں ضرورت نہیں' ان کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میں ان کے تئیں سرپرستی کا رویہ اختیار کرنے کے گناہ کا مرتکب نہیں ہوں گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ انہیں غریب بنانے میں میرا بھی حصہ ہے' تو میں انہیں پرانے کپڑے یا بچی کھچی خوراک نہیں دوں گا بلکہ اپنی بہترین خوراک اور بہترین کپڑے انہیں دونگا اور ان کے کام میں ان کا ساتھ دوں گا۔

خدا نے انسان کو کام کر کے کھانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو لوگ کام کئے بغیر کھانا کھاتے ہیں' وہ چور ہیں۔

یہ قانون کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ مجھے سب سے زیادہ اس وقت سمجھ میں آیا جب میں نے محنت اور روٹی کے بارے میں ٹالسٹائی کی تحریروں کا مطالعہ کیا لیکن میں نے اس سے پہلے بھی رسکن کی کتاب "انٹو دس لاسٹ" کا مطالعہ کرنے کے بعد اس قاعدہ کا احترام کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس متبرک قاعدے پر کہ انسان کو اپنی روٹی ہاتھوں سے محنت کر کے کمانی چاہئیے' سب سے پہلے روسی مصنف ٹی۔ ایم بونڈارف نے زور دیا تھا۔ ٹالسٹائی نے وسیع پیمانے پر اس کی تشہیر کی۔ میرے خیال میں گیتا کے تیسرے باب میں بھی اس اصول کو پیش کیا گیا ہے جہاں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ قربانی پیش کئے بغیر کھانا کھاتے ہیں' وہ چوری شدہ کھانا کھاتے ہیں۔ یہاں قربانی سے مراد روٹی کمانے کے لئے محنت ہی ہو سکتی ہے۔

دلیل سے کام لیں تو بھی ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے۔ وہ انسان جو جسمانی مشقت نہیں کرتا' کھانے کا حقدار کیونکر ہو سکتا ہے؟ بائیبل میں کہا گیا ہے کہ آپ پسینہ بہا کر ہی روٹی کھائیں گے۔ ایک لکھ پتی اگر تمام دن بستر پر پڑا رہے اور اسے کھانا بھی کھلایا جائے' تو وہ جلد ہی زندگی سے اکتا جائے گا۔ اور زیادہ دن اس طریقے سے زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس لئے وہ ورزش کر کے اپنی بھوک

چمکانے کی کوشش کرتا ہے اور کھانا خود سی کھاتا ہے اس طرح اگر ہر امیر اور غریب انسان کو کسی بھی شکل میں ورزش کرنے کی ضرورت ہے تو یہ ورزش ایسی کیوں نہ ہو جس سے پیداوار بھی ہو، یعنی وہ روٹی کمانے کے لئے مشقت کیوں نہ کریں؟ ایک کاشتکار کو کوئی بھی شخص لمبے سانس لینے کی ورزش کرنے یا پٹھوں کی ورزش کے لئے نہیں کہتا۔ اور دنیا کی آبادی کا ۹۰ فیصد سے زیادہ حصہ زمین کی کاشت پر گذر کر رہا ہے۔ دنیا موجودہ حالت کی نسبت کس قدر زیادہ خوش، صحت مند اور پرامن ہو جائے گی۔ اگر باقی کا دس فیصد حصہ بھی اس کثیر آبادی کی مثال کی پیروی کرنا شروع کر دے اور کم از کم اس حد تک ضرور پیروی کرے کہ اپنی روٹی کے لئے مطلوبہ محنت ضرور کرے۔ کھیتی باڑی سے متعلق کئی مشکلات آسانی سے حل ہو جائیں گی۔ اگر یہ لوگ بھی اس میں ہاتھ بٹائیں۔ اس کے علاوہ سماج میں درجوں کا امتیاز ختم ہو جائے گا جب ہر انسان محنت سے روٹی کمانے کا فرض ادا کرے گا۔ یہ بات تمام ورنوں کے لئے مشترکہ ہے۔ سرمایہ اور محنت کے درمیان عالمگیر پیمانے پر کشمکش پائی جاتی ہے اور غریب امیروں سے حسد کرتے ہیں۔ اگر سب لوگ اپنی روٹی کے لئے محنت کریں تو سماج میں درجوں کا امتیاز ختم ہو جائے گا۔ امیر موجود تو رہیں گے لیکن وہ اپنے آپ کو جائداد کا محض امین سمجھیں گے اور اسے عوام کے فائدے کے لئے استعمال میں لائیں گے۔

جو لوگ عدم تشدد پر کاربند رہیں گے، سچائی کی پرستش کریں گے اور برہمچریہ کو ایک قدرتی عمل سمجھ کر اختیار کریں گے۔ ان کے نزدیک روٹی کمانے کے لئے محنت کرنا ایک مبارک کام ہوگا۔ یہ محنت سچے معنوں میں صرف کھیتی باڑی سے متعلق ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس وقت ہر ایک شخص اسے اختیار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم کھیتی باڑی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتے ہوئے بھی زمین کاشت کرنے کی بجائے سوت کاتنے یا کپڑا بننے کا کام یا بڑھئی کا یا لوہار کا کام کر سکتے ہیں۔ ہم میں ہر ایک کو اپنا خاکروب آپ ہونا چاہئے۔ پیٹ خالی کرنے کا عمل بھی ایسا ہی قدرتی ہے

جیسا کہ پیٹ بھرنے کا۔ اور بہترین بات یہی ہوگی کہ ہم میں سے ہر ایک اپنا پاخانہ خود صاف کرے۔ اگر یہ ناممکن ہو تو کم از کم ہر کنبے کو اس سلسلے میں اپنی صفائی کا انتظام خود کرنا چاہئے۔ میں کئی برسوں سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اس نظام میں کچھ بنیادی خرابی ضرور ہے جس میں پاخانے کی صفائی کا کام سماج کے ایک طبقے کو سونپا گیا ہے۔ تاریخ میں اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں کہ کس شخص نے سب سے پہلے صفائی کی اس بنیادی کام کو سب سے نچلے طبقے کو سونپا۔ یہ شخص خواہ کوئی بھی تھا۔ اس نے ایسا کر کے سماج کی خدمت نہیں کی۔ بچپن سے ہی ہمارے ذہن میں یہ چیز بیٹھنی چاہئے کہ ہم سبھی خاکروب ہیں اور ہر اس شخص کے لئے جس نے اس بات کو سمجھ لیا ہے، اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ خاکروب کی حیثیت سے روٹی کمانے کے لئے محنت شروع کرے۔ جب صفائی کا یہ کام اس طرح سوچ سمجھ کر شروع کیا جائے گا تو اس سے انسان کو انسانی مساوات کے اصول کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

معاشی مساوات، عدم تشدد پر مبنی آزادی کے لئے کنجی کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشی میدان میں مساوات کے لئے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان مستقل کشمکش کو ختم کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو ان چند ایک دولت مند افراد کو جن کے ہاتھوں میں قومی دولت کا کثیر حصہ جمع ہے، انہیں نچلی سطح پر لایا جائے۔ اور دوسری طرف نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے والے اور ننگے جسم رہنے والے کروڑوں اشخاص کو زندگی کی بالائی سطح پر لایا جائے۔ عدم تشدد پر مبنی نظام حکومت کا قیام واضح طور پر ناممکن ہو گا جب تک دولت مندوں اور کروڑوں بھوکے لوگوں کے درمیان خلیج موجود رہے گی۔ نئی دہلی میں عالیشان عمارتوں اور ان کے نزدیک ہی غریب محنت کشوں کی خستہ جھونپڑیوں کی موجودگی سے جو تفاوت نظر آتا ہے، وہ آزاد ہندوستان میں ایک دن کے لئے قائم نہیں رہ سکتا۔ آزاد ہندوستان میں غریبوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ملک کے دولت مند ترین لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ اگر دولت

کو اور اس سے حاصل شدہ طاقت کو رضاکارانہ طور پر ترک نہ کیا گیا اور انہیں عوام کی بہبود کے لئے مل کر استعمال میں نہ لایا گیا تو ایک نہ ایک دن خونی انقلاب کا رونما ہونا لازمی ہے۔

میں آپ کو ایک گر سکھاتا ہوں۔ جب بھی آپ شک و شبہے میں ہوں یا جب کبھی خود غرضی آپ پر سوار ہو جائے تو آپ اس وقت اپنے آپ کو اس گر کی مدد سے راہ راست پر رکھ سکتے ہیں۔ آپ اس غریب ترین اور کمزور ترین شخص کا چہرہ اپنے سامنے لائیں۔ جسے آپ نے زندگی میں دیکھا ہو' اور پھر اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ آیا جو قدم آپ اٹھانے والے ہیں اس سے اس غریب ترین اور کمزور ترین انسان کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔ کیا آپ کے اس قدم سے ایسے انسان کو اپنی زندگی اور اپنی قسمت پر قابو پانے میں مدد ملے گی؟ دوسرے الفاظ میں کیا آپ کے اس قدم سے فاقہ کش اور روحانی طور پر بھوکے کروڑوں انسانوں کے لئے سوراج کی منزل قریب آئے گی؛ تب آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کی خود غرضی ختم ہو گئی ہے۔ اور آپ کے تمام شکوک رفع ہو گئے ہیں۔

۶۔ قوم کی بھلائی کے لئے

(الف) ہندوستان کا آدرش

ہندوستان میرے لئے عزیز ترین ملک ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ یہ میرا ملک ہے بلکہ اس لئے کہ میں نے اس میں سب سے زیادہ اچھائی دریافت کی ہے۔

ہندوستان کی ہر چیز میں میرے لئے کشش ہے۔ اس میں ہر وہ چیز موجود ہے جن کی بلند ترین امنگیں رکھنے والے کسی انسان کو خواہش ہو سکتی ہے۔

ہندوستان بنیادی طور پر بھوگ بھومی (وہ ملک جس میں زندگی کا محض لطف اٹھانے پر زور دیا جاتا ہے) کے مقابلے میں کرم بھومی (وہ ملک جس میں فرض کی ادائے گی پر زور دیا جاتا ہے) ہے۔

اگر ہم کسی کو مارے بغیر مرنے کا سبق سیکھ لیں تو ہندوستان جس کا تاریخ میں اور دوسری داستانوں میں کرم بھومی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، روئے زمین پر سچ مچ بہشت کا نمونہ بن جائے گا۔

اگر ہندوستان نے میری زندگی میں تشدد کے اصول کو اپنا لیا تو مجھے ہندوستان میں رہنے کی خواہش نہیں رہے گی۔ ایسے ہندوستان پر میں ناز نہیں کر سکوں گا۔ وطن سے میری محبت میرے دھرم کے تحت ہے۔ جس طرح بچہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے چمٹتا ہے، اس طرح میں ہندوستان

کے ساتھ اس لئے چمٹا ہوا ہوں کیونکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس سے مجھے روحانی خوراک ملتی ہے
اس کا ماحول میری بلند ترین امنگوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ جب یہ اعتماد اٹھ جائے گا تو میں
اپنے آپ کو ایک ایسے یتیم کی طرح محسوس کروں گا جسے اپنا سرپرست ملنے کی امید نہ رہی ہو۔

میرا یہ یقین روز بروز پختہ ہو رہا ہے کہ ہم اچھے چلن یعنی سچائی اور عدم تشدد کے بغیر اس
ملک کے رنجیدہ لوگوں کو خوش نہیں کر سکتے۔

میں نہایت عجز سے یہ تجویز پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان نے
عدم تشدد اور سچائی کی راہ پر چل کر اپنا مقام پالیا تو یہ امن عالم کے حق میں اس کا قابل قدر حصہ ہوگا
جس کی دنیا کی تمام اقوام کو تلاش ہے۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے ہندوستان اس فراخدلانہ
مدد کے کچھ حصے کی ادائگی کر سکے گا جو ان اقوام کی طرف اسے دی جاتی رہی ہے۔

میں دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انسان ایک دوسرے کا جو خون بہاتے
ہیں، دنیا اس سے بالکل تنگ آچکی ہے۔ دنیا اس تاریکی میں سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہے
اور میں اپنے اعتقاد پر خوشی محسوس کر سکتا ہوں کہ شاید دنیا کو یہ راستہ دکھانے کا فخر اس قدیم
ملک، ہندوستان کو حاصل ہو۔

میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان نے جس تہذیب کو جنم دیا ہے وہ دنیا میں ختم نہیں ہوگی۔
ہمارے آبا واجداد نے جو بیج بوئے ہیں ان کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی نجات مغربی ملکوں کے خونی راستے پر چلنے میں نہیں جس سے خود مغربی
ممالک تنگ آرہے ہیں۔ بلکہ ہندوستان کو امن کی راہ پر چلنا ہے جس میں خون بہانے کی گنجائش
نہیں۔ یہ راہ ایک سادہ اور نیک زندگی کے ذریعے ہی اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان
کہیں اپنی روح نہ کھو بیٹھے۔ وہ اسے کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں مغرب کے سیلاب سے دور نہیں

بھاگ سکتا۔ البتہ ہندوستان کو اتنا مضبوط ہونا چاہئے کہ وہ تمام دنیا کے لئے اور خود اپنے لئے اس سیلاب کو روک سکے۔

میں بڑے عجز سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم مغربی ملکوں سے کئی مفید باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ دانشمندی پر کسی ایک برّاعظم یا نسل کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔

یورپی تہذیب بلاشبہ یورپ کے لوگوں کے موافق ہے لیکن اس کی نقل کرنے سے ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں جو اچھی باتیں ہیں اور جنہیں ہم اپنے اندر جذب کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں بھی اختیار نہ کریں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یورپینوں کو اس برائی کو جو ان میں داخل ہو گئی ہے، ترک نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ برائی مادی آسائشوں کے لئے اور ان میں اضافہ کرنے کی مسلسل تلاش ہے اور میں جرأت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ خود یورپینوں کو اپنے نقطہ نظر پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ اگر وہ ان آسائشوں کے بوجھ تلے ہی دب نہیں جانا چاہتے۔ جن کے وہ عادی ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ خیال غلط ہو لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ بات یقینی ہے کہ اس راستہ پر چلنا اس کی موت کے مترادف ہو گا۔ ہمیں ایک مغربی فلاسفر کے ان الفاظ کو اپنے دل میں جگہ دینی چاہئے کہ ہمارا فرض سادہ اور بلند خیالی کی زندگی بسر کرنا ہے آج یہ بات یقینی ہے کہ کروڑوں انسان بلند معیار زندگی کو اختیار نہیں کر سکتے اور خطرہ ہے کہ ہم کچھ اشخاص جو عوام کے لئے سوچنے کا دعویٰ کرتے ہیں بلند معیار زندگی کی تلاش میں کہیں بلند خیالی سے محروم نہ ہو جائیں۔

مغرب سے جو روشنی مل سکتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے سے مجھے کوئی چیز روک نہیں سکتی مجھے صرف اتنا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے کہ میں مغرب کی چمک دمک میں کھو نہ جاؤں اور اس چمک دمک کو اصل روشنی ہی نہ سمجھنے لگوں۔

میں ایسا مکان نہیں چاہتا جس کے چاروں طرف دیواریں ہوں اور اس کی کھڑکیاں بھی بند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام ملکوں کے کلچر کی ہوا میرے مکان کے آس پاس آزادانہ چلے لیکن میں اس ہوا کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ وہ مجھے اڑا کر ہی لے جائے۔ میں ایک گداگر، غلام یا درانداز کی حیثیت سے دوسروں کے مکان میں نہیں رہنا چاہتا۔

ہمیں غلط مثالوں کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیئے۔ یورپی مصنفوں کو صحیح معلومات اور تجربے کی کمی کی وجہ سے مشکل پیش آرہی ہے۔ وہ یورپ کی مثالوں سے ہماری رہنمائی ایک حد سے آگے نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ مثالیں ہندوستان کے حالات سے پوری مطابقت نہیں رکھتیں یورپ میں وہ حالات نہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ روس میں ہندوستان کے سے حالات نہیں۔

اس لئے جو بات یورپ کے لئے درست ہو سکتی ہے وہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے لئے بھی درست ہو۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر قوم کے کردار کی کچھ خاص باتیں ہوتی ہیں اور ہر قوم کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اپنی شخصیت ہے اور اگر ہم اس کی متعدد مشکلوں کا کوئی حل تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ہی کوئی علاج تجویز کرنا ہوگا۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان کو یورپ کی طرح صنعتی ملک بنانا ایک ناممکن بات ہے۔ ہندوستان نے کئی طوفانوں کا سامنا کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں ہر طوفان نے ہندوستان پر اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستان نے ابھی تک دلیری سے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ہندوستان دنیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جنہوں نے کئی تہذیبوں کا زوال دیکھا ہے لیکن خود اسے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ ہندوستان دنیا کی ان چند قوموں میں سے ہے جنہوں نے اپنے کچھ قدیم اداروں کو قائم رکھا ہے۔ اگرچہ ان پر توہمات

اور غلطیوں کی گرد چھاگئی ہے۔ لیکن ہندوستان نے ابھی تک اس بات کا ثبوت بھی دیا ہے کہ اس میں توہمات اور غلطیوں سے نجات حاصل کرنے کی طاقت موجود ہے۔ میرا یہ یقین آج پہلے سے بھی زیادہ روشن ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کو جس اقتصادی مسئلے کا سامنا ہے ہندوستان اسے حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس وقت یورپ میں جو ہلچل موجود ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید تہذیب مادی اور تاریکی کی قوتوں کی نمایندگی کرتی ہے جبکہ قدیم تہذیب یعنی ہندوستانی تہذیب متبرک قوت کی مظہر ہے۔ جدید تہذیب بنیادی طور پر مادیت کی مظہر ہے۔ جدید تہذیب مادہ سے متعلق قوانین کی تحقیق میں مصروف عمل ہے اور عقل انسانی کی مدد سے ذرائع پیداوار اور بربادی لانے والے ہتھیار دریافت کرنے کے لئے کوشاں ہے جبکہ ہماری تہذیب بنیادی طور پر روحانی ضوابط کی تحقیق میں مصروف ہے۔

ہمارے شاستروں میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ سچائی، پاکدامنی، ہر جاندار چیز کے لئے ایماندارانہ احترام، دوسروں کی اشیا کو للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھنا، اور اپنی روزمرہ کی ضروریات سے زیادہ کچھ جمع نہ کرنا، نیکی کی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ اور اس قسم کی زندگی بسر کئے بغیر خدا کے بارے میں کچھ جاننا ناممکن ہے۔ ہماری تہذیب بڑی جرأت سے ہمیں یہ سکھلاتی ہیں کہ اہنسا کا وصف جس کا مطلب پاک ترین محبت اور رحم ہے ——— اپنے اندر پیدا کرنے سے ہم تمام دنیا کو اپنے قدموں میں جھکا سکتے ہیں۔ اس بات کو دریافت کرنے والا شخص بے شمار ایسی مثالیں پیش کر رہا ہے جو ہمیں اس کی صداقت کا یقین دلا سکتی ہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اہنسا پر عمل کرنے میں کسی قسم کی جوابی کارروائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اگرچہ اپنی آخری منزلوں پر یہ درحقیقت فریق ثانی کو بھی ایسا ہی عمل کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہم میں سے بہت سے

لوگوں کا یہ اعتقاد ہے ــــ اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں ــــ کہ ہم اپنی تہذیب کے ذریعے دنیا کو ایک پیغام دے سکتے ہیں۔

(ب) ہندوستانی ایک قوم ہیں

میرے کہنے کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ چونکہ ہم ایک قوم کے فرد تھے اس لئے ہم میں اختلافات نہ پائے جاتے تھے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بڑے بڑے آدمیوں نے پا پیادہ یا بیل گاڑیوں پر بھارت بھر کا سفر کیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی زبانیں سیکھی تھیں۔ اور ان میں کسی قسم کا کوئی بھید بھاؤ نہ پایا جاتا تھا۔ ہمارے جن دور اندیش بزرگوں نے جنوب میں سیتو بندھ (رامیشور) مشرق میں جگن ناتھ اور شمال میں ہردوار کو زیارت گاہیں بنایا تھا آپ کے خیال میں ان کا مقصد اور منشا کیا رہا تھا۔ ؟ آپ مانیں گے کہ وہ کسی طور کم اندیش نہ تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ خدا کی عبادت گھر پر رہ کر بھی کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ گنگا ان لوگوں کے گھروں میں بہتی ہے جن کے قلب بہ نظر حق پرستی سے روشن ہوتے ہیں۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان ایک غیر منقسم ملک ہے۔ قدرت نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔ لہٰذا ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک ہی ملک ہونا چاہیئے۔ اور اسی بات کے پیش نظر انہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں مقدس مقامات بنائے۔ اور ہم سب ہندوستانی ایک ہیں۔ ہم میں وہ اتحاد پایا جاتا ہے جو دو انگریزوں کے درمیان بھی ممکن نہیں۔ میں، آپ اور وہ ایسے دوسرے لوگ جو اپنے آپ کو مہذب اور برتر سمجھتے ہیں، یہ تصور کر لیتے ہیں کہ متعدد قوموں کے فرد ہیں

ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہندوستانی ایک قوم نہیں۔ غیر ملکیوں کے یہاں آنے اور بس جانے سے قوم کا تار و پود

بکھرتا نہیں۔ بلکہ وہ خود اس کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ اور ایک ملک تبھی ایک قوم ہو سکتا ہے، جب اس میں یہ خاصیت موجود ہو۔ ملک میں اخذ و قبول کی صلاحیت لازمی طور پر ہونی چاہیئے۔ اور ہندوستان ہمیشہ ایسا ہی ملک رہا ہے۔ حقیقت میں بھارت میں جتنے لوگ ہیں اتنے ہی مذہب ہیں۔ لیکن جو لوگ قومیت کے جوہر سے باخبر ہیں، وہ ایک دوسرے کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتے۔ اگر ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کو رہنا چاہیئے تو وہ خواب کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ جن ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور عیسائیوں نے ہندوستان کو اپنا ملک بنالیا ہے، وہ ایک دوسرے کے ہم وطن ہیں اور یہ کہ انہیں اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہنا ہوگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا اپنا مفاد بھی اسی میں ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں ایک قومیت اور ایک مذہب کو ایک دوسرے کا مترادف نہیں سمجھا جاتا۔ اور ہندوستان میں بھی ایسا کبھی نہیں سمجھا گیا۔

ہندو اور مسلمان، دونوں ہی بھارت کے بیٹے ہیں۔ جو ماں ہمیں جنم دیتی ہیں وہ عزت احترام اور عبادت کی مستحق ہے۔ ایسی عبادت سے روح پاکیزہ بنتی ہے۔ یہ صورت تو ماں کے تئیں ہے۔ مادر وطن کے تئیں کتنا احترام اور سلوک ہم پر واجب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم اسی ماں کے آغوش میں پھل پھول کر بڑے ہوتے اور پھر اسی ماں کے آغوش میں سما جاتے ہیں۔ وہ سبھی لوگ جو اس ملک میں پیدا ہوئے ہیں اور جو اسے اپنا ملک سمجھتے ہیں، وہ اسی دھرتی کے بیٹے ہیں، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، سکھ ہوں یا جین۔ لہٰذا وہ بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک ایسے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، جو خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔

ہندوستان ان سب لوگوں کا ملک ہے جو یہاں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے ہیں۔ اور جن کی نظریں کسی دوسرے ملک پر نہیں لگی ہوئی ہیں۔ چنانچہ یہ ملک پارسیوں، بنی اسرائیلیوں

ہندوستانی عیسائیوں، مسلمانوں اور دوسرے غیر ہندوؤں کا ویسا ہی ہے، جیسا کہ ہندوؤں کا ہے۔ آزاد ہندوستان کے معنی ہندو راج کے نہیں۔ اس کے معنی ہندوستانی راج کے ہیں۔ جو کسی ایک مذہبی فرقے کی اکثریت پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر عوام کے نمائندوں کی اکثریت پر مبنی ہوگا۔ اور اس میں مذہب کا امتیاز قطعی روا نہ رکھا جائے گا۔ میرے نزدیک ایک ایسی ملی جلی اکثریت بعید از قیاس نہیں جو ہندوؤں کو اقلیت میں بدل دے۔ لوگوں کو ان کی قابلیتوں اور انجام دی گئی خدمات کے پیش نظر منتخب کیا جائے گا۔ مذہب ایک شخصی معاملہ ہے۔ سیاست میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔

لسانی بنیادوں پر صوبوں کی دوبارہ تقسیم کو ہندوستان کے بنیادی اتحاد میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ خود اختیاری کے معنی انتشار کے نہیں۔ اور یہ معنی ہونے بھی نہیں چاہئیں۔ کہ اس کے بعد صوبے من مانی کرنے لگیں۔ اور ایک دوسرے کو یا مرکز کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اگر ہر صوبے اپنے آپ کو الگ تھلگ اور خود مختار سمجھنے لگے تو ہندوستان کی آزادی اپنے معنی اور مفہوم کھو بیٹھے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے صوبوں کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔

دنیا ہمیں گجراتی، مہاراشٹری وغیرہ کی حیثیت سے نہیں جانتی۔ وہ ہمیں صرف ہندوستانی سمجھتی اور جانتی ہے۔

لہذا ہمیں بڑی ثابت قدمی کے ساتھ انتشار پھیلانے والی قوتوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے اور خود کو ہندوستانی سمجھنا اور ہندوستانیوں کا سا چلن اختیار کرنا چاہئے۔

صوبہ پرستی کی ایک صحت مند صورت بھی ہے اور یہ ہمیشہ رہے گی۔ اگر مختلف صوبوں کے درمیان صحت مند قسم کے اختلافات نہ ہوں۔ تو الگ الگ صوبے بنانا بے معنی سی بات ہو گی۔ لیکن ہماری صوبہ پرستی تنگ نظری پر مبنی نہیں ہونی چاہئے۔ صوبے ملک کے مفاد؛

کے منافی نہ ہوں ۔ اس لئے کہ تمام صوبے ملک کے مختلف حصے ہی تو ہیں۔ انہیں
ایک عظیم دریا کی شاخوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ شاخیں یہ معادن ندیاں دریا کی طاقت
اور عظمت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی طاقت اور پاکیزگی عظیم انسانی دھارے سے نمایاں ہوگی
یہی صورت حال صوبوں کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ صوبے جو کچھ کریں، وہ سارے ملک
کے لئے باعث افتخار ہونا چاہیئے۔ اگر رابندر ناتھ ٹیگور نے بنگال کے گن گائے ہیں، تو ان
سے ہندوستان کا نام بھی اونچا ہوا ہے۔ کیا یہ اثر سارے ہندوستان میں جاری و ساری
نہیں ہے ؟ دادا بھائی صرف پارسیوں کے لئے، بمبئی کے لئے نہیں، سارے ہندوستان
کے لئے جیئے۔ صوبوں کے درمیان کسی حسد یا جداگانہ روش کی کوئی گنجائش نہیں، تاوقتیکہ
بھارت ایسے جنگ آزما حصوں میں بٹ جائے جو محض اپنے لئے جیئیں اور اگر ممکن ہو تو دوسروں
کو نقصان پہنچا کر اپنے ہی مفاد کا خیال رکھیں ۔ اگر ایسی صورت حال ملک میں پیدا ہو جائے
تو کانگرس کے کئے دھرے پر پانی پھر جائے۔ ملک کو الگ تھلگ حصوں اور خانوں میں بانٹنے
کے لئے کی جانے والی ہر کوشش کی روک تھام کی جانی چاہیئے۔ ہندوستان کو ایک آزاد
اور مضبوط ملک بننا ہے اور دنیا کی ترقی میں ایک بے مثل کردار انجام دینا ہے۔ ہماری
حب الوطنی کسی بھی مرحلے پر صرف ہمارے لئے مخصوص نہیں۔ ہم دنیا کی دوسری قوموں کو
نقصان پہنچا کر خوشحال بننے کی خواہش نہیں رکھتے۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب
ہم یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے " جیسے ہم ہندوستان کے شہری ہیں، ویسے ہی دنیا کے بھی
ہیں"۔ لیکن ایسا وقت تبھی آئے گا جب ہم آزاد ہندوستان کے شہری ہونے کے فن
سے آگاہ ہو جائیں گے۔ اور اگر ہم صوبہ پرستی کے زہریلے جذبے کو پروان چڑھنے دیں گے
تو ظاہر ہے یہ فن ہم کبھی نہ سیکھ سکیں گے۔ صحیح قومی زندگی فرد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

میں آزاد اور طاقتور بننا چاہتا ہوں، محض اپنے لئے نہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ میرا پڑوسی میری طاقت اور آزادی سے فائدہ اٹھا سکے۔ افراد یا صوبوں کی حیثیت سے ہمیں مادر وطن کی خدمت کے لئے اپنی بہترین خدمات پیش کرنی چاہئیں۔

ذات پات کا فرق ہماری زندگی میں گہری جڑیں پکڑ گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس امتیاز نے مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ طبقاتی حد بندیاں، کم یا بیش، دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساری انسانی نسل اس خرابی میں مبتلا ہے۔ مذہب کو اس کے صحیح معنوں میں اپنا کر اس خرابی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ان امتیاز اور حد بندیوں کا جواز کسی بھی مذہب کی مقدس کتابوں میں نہیں۔

مذہب کی نگاہ میں سبھی انسان برابر ہیں۔ علم، ذہانت اور دولت سے کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ خود کو ایسے لوگوں سے بالا و برتر سمجھے جو ان سے محروم ہیں۔ اگر کوئی شخص سچے مذہب کے نظم و ضبط اور پاکیزہ بنانے والے جوہر سے خود کو پاک و نیک بنا چکا ہے۔ تو وہ اپنی سہولتوں میں ایسے لوگوں کو حصہ دار بنانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جن کے حصے میں وہ سہولتیں کم آئی ہیں۔

صوبہ اور ذات پات کی دیوار میں دراڑ پڑنی ہی چاہیئے۔ اگر ہندوستان ایک اور ناقابل تقسیم ملک ہے۔ تو اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے غیر مربوط گروہوں اور ٹکڑوں میں بانٹنے والی مصنوعی حد بندیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس ظالمانہ رسم کی پشت پر کوئی مذہب کارفرما نہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ افراد اصطلاحی کاموں کو شروع ہی نہیں کر سکتے اور یہ کہ انہیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے جب تک سارا سماج اس تبدیلی کے لئے

نہیں ہو جاتا۔ ہمیشہ نڈر افراد نے غیر انسانی رسوم اور رواجوں کا قلع قمع کرکے اصلاحی کام کئے ہیں۔

اتحاد کس شے میں مضمر ہے اور اسے کس بہتر طریقے پر بڑھاوا دیا جا سکتا ہے ؟ اس کا جواب بہت سیدھا سادہ ہے۔ اتحاد ہمارے سانجھے مقصد، مشترکہ نصب العین، اور سانجھے دکھ سکھ میں ہے۔ مشترکہ نصب العین کو حاصل کرنے میں معاون بن کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر اور باہمی رواداری سے کام لے کر اتحاد کو بہتر طریقے پر بڑھاوا دیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان نے بغیر کسی خون خرابے کے آزادی حاصل کی ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے، جس نے ساری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ ہم اس آزادی کے اہل تھے۔ ہمیں اس بات کا ثبوت اپنے صحیح کردار سے دینا ہے۔

میں چاہوں گا کہ میرے خوابوں کا نیا بھارت اپنے قدرتی ماحول میں ایک نئی زندگی کی بنیاد ڈالے۔ بہترین سماج کی تشکیل ہی ایک ایسا مقصد ہے، جس کی تکمیل کے لئے بھارت کو اپنی تمام تر کوششیں وقف کر دینی چاہئیں۔

ہندوستان اب آزاد ہے۔ اور اب حقیقت مجھ پر بالکل واضح ہو چکی ہے۔ اب محکومی کا بار اٹھ چکا ہے۔ اب نیکی و خیر کی تمام قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے ہمیں ہندوستان کو ایک ایسا ملک بنانا ہے، جہاں انسانی جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے، خواہ وہ دو ریاستوں کے درمیان ہوں، یا عوام کے دو فرقوں کے درمیان۔ تشدد کے لگے بندھے طریقے پر تکیہ نہ کیا جائے گا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ ہندوستان توقع کے عین شایان شان ثابت ہوگا اور یہ ثابت کر دکھلائے گا کہ دو نئی مملکتوں کا قیام باقی دنیا کے لئے خطرے کا نہیں،

برکت کا باعث ہوگا۔

ہندوستان میں اگر کسی اقلیت کو مذہبی اقلیت ہونے کی بنا پر خفّت کا سامنا کرنا پڑے تو میں کہوں گا کہ یہ ہندوستان میرے خوابوں کا ہندوستان نہیں۔ جس ہندوستان کی تشکیل کے لئے میں نے تمام عمر کام کیا ہے اس میں، ہر فرد ہر لشبر کو قطع نظر اس کے مذہب کے، مساوات حاصل ہے۔ اس مملکت کو مکمل طور پر سیکولر ہونا ہے۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ کسی فرقہ وارانہ تعلیمی ادارے کو سرکار کی سرپرستی حاصل نہیں ہونی چاہیئے۔

خدا کا خوف رکھنے والے آدمی سبھی مذاہب کو اچھا اور ایک سا سمجھتے ہیں۔

(ج) میرے خوابوں کا ہندوستان

میں ایک ایسے ہندوستان کے لئے کام کروں گا جس میں غریب سے غریب آدمی بھی یہ محسوس کریں گے کہ یہ ان کا اپنا ملک ہے۔ اور اس کی تعمیر و ترقی میں ان کی آواز کی بھی اہمیت ہے۔ اس ملک میں عوام کے چھوٹے بڑے طبقے نہیں ہوں گے۔ اور تمام طبقوں میں مکمل ہم آہنگی ہوگی۔ ایسے ہندوستان میں چھوت چھات اور منشی اشیا اور دواؤں کا کوئی مقام نہیں ہوگا۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ چونکہ ہم تمام دنیا کے ساتھ امن و امان سے رہیں گے اس لئے نہ ہمارا استحصال ہوگا اور نہ ہم کسی کا استحصال کریں گے ہماری فوج ممکن حد تک کم سے کم ہوگی۔ ایسے تمام ملکی و غیر ملکی مفادات کا بے حد احترام کیا جائے گا جو کروڑوں بے آواز انسانوں کے مفادات کے منافی نہ ہوں گے۔ ذاتی طور پر میں ملکی اور غیر ملکی کے امتیاز سے نفرت کرتا ہوں .... میرے خوابوں کا ہندوستان ایسا ہوگا........ اس سے کم پر میں مطمئن نہیں ہوں گا۔

میں بہت سی نئی چیزیں لکھنا چاہتا ہوں لیکن وہ سب ہندوستان کے پس منظر ہی میں لکھی جانی چاہئیں۔

میرا سوراج ایسا ہوگا جس میں ہمارے تمدّن کی قدریں محفوظ و برقرار رہیں گی۔ زندگی کی ضروریات سے آپ امیروں اور شہزادوں کے ساتھ مل کر لطف اندوز ہو سکیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کے پاس ان جیسے بڑے بڑے محل ہوں گے۔ یہ محل مسرت و شادمانی کے لئے لازمی وضروری نہیں ہیں۔

بہرحال آپ کو زندگی کی وہ تمام سہولیات اور آرام میسر ہوں گے جن سے ایک امیر آدمی لطف اندوز ہوتا ہے۔ مجھے اس میں رتی بھر شک نہیں کہ سوراجیہ اس وقت تک مکمل سوراجیہ نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے تحت آپ کے لئے یہ تمام سہولیات فراہم نہیں ہو جاتیں۔

س۔ یہ بات کب کہی جا سکے گی کہ ہندوستان نے پورن سوراجیہ حاصل کر لیا ہے؟

ج۔ جب عوام یہ محسوس کریں گے کہ وہ اپنی بہتری و بہبود کے لئے خود بہت کچھ کر سکتے ہیں اور اپنی تقدیر اپنی مرضی کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

یہ میرا اعتقاد ہے اور میں اسے ان گنت دفعہ دہرا چکا ہوں کہ ہندوستان چند شہروں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ہندوستان ۷ لاکھ گاؤں میں واقع ہے۔ لیکن ہم شہروں میں رہنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان شہروں میں ہی ہے۔ اور گاؤں صرف ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بنے ہیں۔ ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ کیا گاؤں والوں کو پوری خوراک اور دھوپ اور بارش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے کپڑے بھی میسر ہوتے ہیں یا نہیں۔

شہروں کو گاؤں کو تباہ کرنے کا رویہ دیہی باشندوں کی زندگی اور آزادی کے لئے ایک مسلسل خطرہ بنا ہوا ہے۔

اگر شہر والے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ گاؤں والوں کے مفاد کو عزیز رکھتے ہیں تو ان کے زیادہ سے زیادہ ذرائع غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے بروئے کار آنے چاہیئں۔

دیہی عوام کو شہر والے لوٹ کھسوٹ رہے ہیں۔ میرے خیال میں ان اشیا کی شہروں میں بنانے کی اجازت نہیں دی جائے جو کہ گاؤں والے اچھے اور بہتر ڈھنگ سے تیار کر سکتے ہیں۔ شہروں کا کام ہے گاؤں میں بنی اشیا کی کھپت کرنا۔ اور گاؤں کو خود کفیل بننا چاہیئے اگر ہمیں "عدم تشدد" پر کاربند رہ کر کام کرنا ہے تو مجھے کوئی اور حل دکھائی نہیں دیتا۔

شہر اپنی دیکھ بھال کرنے کے قابل ہیں۔ ہمیں گاؤں کو بھی اسی قابل بنانا ہے۔ ہمیں انہیں تعصبات، اوہام پرستی اور تنگ نظری سے چھٹکارا دلانا ہے اور یہ ہم ان کے درمیان رہ کر، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر، ان میں تعلیم پھیلا کر اور انہیں ضروری معلومات بہم پہنچا کر ہی کر سکتے ہیں۔

ہمیں ان گاؤں والوں سے متعارف ہونا چاہیئے جو کڑی دھوپ میں محنت و مشقت کرتے ہیں اور ہمیں احساس ہونا چاہیئے کہ کیا ہم اس تالاب سے پانی پینا پسند کریں گے جس میں دیہات والے نہاتے ہیں، کپڑے اور برتن دھوتے ہیں۔ اور جس میں ان کے مویشی گھومتے ہیں اور پانی پیتے ہیں۔ جب ہم ایسا کریں گے تب ہم صحیح معنوں میں ان کی نمائندگی کریں گے اور تب مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی ہماری پکار پر کان دھریں گے۔

ہم کو انہیں یہ بتانا ہے کہ وہ وقت، صحت اور روپے کو کس طرح کفایت شعاری اور بہتر ڈھنگ سے استعمال کریں۔ لائیونل کرٹس نے ہمارے گاؤں کو گوبر کے "ڈھیر"

کہا ہے۔ ہمیں ان گاؤں کو مثالی گاؤں میں تبدیل کرنا ہے۔ ہمارے دیہی عوام کو تازہ ہوا نصیب نہیں ہوتی حالانکہ وہ چاروں طرف سے تازہ ہوا سے گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں تازہ خوراک نہیں ملتی حالانکہ ان کے چاروں طرف تازہ ترین خوراک موجود ہوتی ہے۔ میں ایک مبلغ کی مانند بات کر رہا ہوں کیونکہ میرا مقصد گاؤں کو خوبصورت و حسین بنانا ہے۔

دیہی صنعتی اسکیم کے پیچھے یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی روزانہ ضروریات گاؤں والے پوری کریں اور اگر وہ کچھ اشیاء ٹھیک طرح سے سپلائی نہیں کر سکیں تو ہمیں پتہ لگانا چاہئے کہ کیا معمولی تنظیم و محنت سے گاؤں والے منافع کما کر یہ اشیاء سپلائی نہیں کر سکتے ؛ منافع کا اندازہ کرتے وقت ہمیں اپنے آپ کو نہیں بلکہ گاؤں والوں کو دھیان میں رکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں ہمیں عام قیمت سے کچھ زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے اور چیز بھی کچھ گھٹیا ملے۔ لیکن اگر ہم اپنی ضروریات میں دلچسپی لیں گے، اسے بہتر بنانے پر زور دیں گے اور انہیں بہتر بنانے میں گاؤں والوں کی مدد کرنے کی تکلیف گوارا کریں گے تو اچھی اور بڑھیا چیزیں ملنے لگیں۔

گاؤں والوں کو اپنی کاریگری کو اس درجہ کمال تک پہنچا دینا چاہئے کہ ان کی اشیاء تیار ہوتی ہی بیرونی مارکیٹ میں بک جائیں۔ جب ہمارے دیہات مکمل طور پر ترقی یافتہ بن جائیں گے تب اعلیٰ پائے کے کاریگروں کی وہاں کمی نہیں رہے گی۔ تب گاؤں میں دیہاتی شاعر، دیہاتی آرٹسٹ، دیہاتی معمار، دیہاتی زبان کے عالم اور دیہی تحقیق کرنے والے موجود ہوں گے۔ تب زندگی کی کوئی بھی ایسی ضرورت نہیں ہوگی جو گاؤں میں میسر نہ ہو۔ آج گاؤں دگوبر کے ڈھیر ہیں مگر کل وہ جنت کی صورت اختیار کر جائیں گے جہاں کے لوگ ذہین اور سمجھدار ہوں گے جنہیں کوئی لوٹ کھسوٹ نہیں سکے گا۔

خدا نے انسان کو اس لئے تخلیق کیا ہے کہ وہ اپنی خوراک کے لئے محنت کرے نیز

خدا نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ بغیر کام کئے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔ ہندوستان کے اسی فیصد لوگ سال میں چھ مہینے مجبوراً چور بنے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر سارا ہندوستان ایک وسیع وعریض جیل بنا ہوا ہے تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؛ یہ بھوک ہے جو ہندوستانیوں کو چرخے کی جانب متوجہ کررہی ہے۔ چرخے کی پکار اہم ترین پکار ہے کیونکہ یہ محبت کی پکار ہے اور پیار سوراجیہ ہے۔ ہمارے ملک کے کروڑوں بھوک سے مرتے انسانوں کے لئے چرخہ امرت کی مانند ہے۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ میں جسے اپنے کھانے پینے کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہیں کیوں چرخہ کاتوں؛ (اس کا جواب یہ ہے) کیونکہ میں جو شئے کھا رہا ہوں وہ میری نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنے ہم وطنوں سے چھین جھپٹ کر کھانے کی چیزیں حاصل کرتا ہوں۔ اگر آپ اس بات پر غور کریں کہ ہر ایک پیسہ جو آپ کی جیب میں جاتا ہے کہاں سے آتا ہے تو آپ بخوبی میری باتیں سمجھ جائیں گے۔ اگر کروڑوں آدمیوں کو یہ پتہ نہ ہو کہ وہ اپنی بے کاری کو کیسے دور کریں تو سوراجیہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ چرخہ کاتنے میں یہ دلیل ہے کہ اس سے محنت ومشقت کی بڑائی اور عظمت کا اعتراف ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کھادی کی حمایت میں تبلیغ کرکے میں سفینۂ آزادی کو مخالف ہوا کی طرف لے جارہا ہوں اور میں اسے ضرور غرق کردوں گا۔ میں اس مختصر جائزے میں کھادی کی حمایت میں دلائل پیش نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں اس سے پہلے بہت دلائل پیش کرچکا ہوں۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر کانگریسی بلکہ ہر ہندوستانی کھادی کے فروغ کے لئے کیا کرسکتا ہے؛ کھادی ملک میں تمام لوگوں کی اقتصادی آزادی اور مساوات کی آئینہ دار ہے۔ مٹھائی کی عمدگی اس کے کھانے سے ہی پتہ چلتی ہے۔ لہٰذا ہر مرد وزن کو تجربہ کرنا چاہئے، اس سے اسے معلوم

ہو جائے گا کہ میرے نظریے میں کتنی حقیقت ہے۔ تمام پیچیدگیوں اور دشواریوں کے باوجود کھادی کا استعمال کرنا چاہئے۔ کھادی کے استعمال سے مراد ہے اپنے دل و دماغ کو مکمل طور پر سودیشی بنا لینا یعنی یہ تہیہ کر لینا کہ میں اپنی تمام ضرورتیں اپنے ملک ہندوستان کی اور وہ بھی گاؤں کی محنت اور دماغ سے تیار کی ہوئی چیزوں سے پورا کروں گا۔ اس کے معنی ہیں موجودہ طریقۂ کار میں یکسر تبدیلی۔ مجھے اس طرح کہنا چاہئے کہ ہندوستان کے سات لاکھ گاؤں برطانیہ اور چند ہندوستانی شہروں کے استحصال پر زندہ رہنے کی بجائے پوری طرح خود کفیل ہو جائیں گے۔ اور وہ رضاکارانہ طور پر اسی وقت ہندوستان کے شہروں اور بیرونی دنیا کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ اسی طرح دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بہت سے افراد کے ذہن اور مذاق میں تبدیلی لائی جائے۔ اہنسا کا راستہ آسان ہے مگر کئی دوسرے لحاظ سے یہ راستہ بہت مشکل ہے۔ اہنسا ہر ہندوستانی کی زندگی پر اثر انداز ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کے اندر جو طاقت پنہاں ہے اس سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔ اور وہ ہندوستان کے تمام لوگوں کے ساتھ مل کر فخر محسوس کرتا ہے۔

عدم تشدد کوئی حماقت یا بیوقوفی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم صدیوں سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ بلکہ یہ بنی نوع انسان کی ایک زبردست طاقت ہے۔ جس پر اس کے وجود کا انحصار ہے۔ یہی قوت کا وہ نظریہ ہے جو میں نے کانگریس کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور اس کے ذریعے باقی دنیا کو اس سے روشناس کرایا ہے۔ میرے لئے کھادی ہندوستانی عوام کے اتحاد، اقتصادی آزادی اور مساوات کا وسیلہ ہے۔ جس کی جواہر لال نہرو۔۔

یہ شاعرانہ تشریح کی ہے۔ "یہ ہندوستان کی آزادی کا 'لباس' ہے"۔

کھادی کو اپنانے کا مطلب ہے، تمام ضروریات زندگی کی پیداوار اور تقسیم کی لامرکزیت کو تسلیم کرنا۔ اس کام کے لئے یہ طریقہ کام میں لانا چاہیئے کہ ہر گاؤں اپنی ضرورت کی چیزیں تیار کرے اور استعمال کرے۔ نیز شہروں کی ضروریات کا کچھ حصہ بھی تیار کرے۔

بھاری صنعتوں میں لازمی طور پر مرکزیت ہونی چاہیئے اور انہیں قومی ملکیت میں ہونا چاہیئے۔

میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ اگر آپ کے اندر سودیشی کا جذبہ ہوگا تو آپ اپنی اہم ضروریات کے لئے مغرب کی طرف دیکھنا بند کر دیں گے۔ اس وقت جب کہ چیزوں کی انتہائی کمی ہے۔ میں اس بات کی مخالفت نہیں کروں گا۔ اگر ہندوستان باہر سے خوراک اور کپڑا منگوائے بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ہندوستان ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، لیکن یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوئی۔ میں یہ بات کہنے میں پس وپیش نہیں کرتا اور میں اسے پھر دہراتا ہوں کہ ہندوستان کے ان گنت گاؤں اپنی ضرورت بھر کھادی تیار کرنے اور اناج پیدا کرنے کے قابل ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ لوگ اتنے سست اور کاہل ہو گئے ہیں کہ ملک کے اندر ہی اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میں ان دو ضروریات کے لئے مغرب کی جانب دیکھنے کے بجائے عریانی اور بھوک برداشت کروں گا۔ مصمم ارادے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔

ہم گاؤں کی سادہ زندگی میں ہی سچائی اور عدم تشدد یروئے کار لا سکتے ہیں۔ اگر آج دنیا غلط راستے پر چل رہی ہے تو مجھے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ

ہندوستان اسی راستہ چل پڑے اور جس طرح پروانہ روشنی کے چاروں طرف گھوم گھوم کر اس میں جل مرتا ہے، اسی طرح ہندوستان بھی ختم ہو جائے۔ مگر زندگی کے آخری لمحہ تک یہ میرا فرض ہے کہ میں ہندوستان کو اور اس کے واسطے سے ساری دنیا کو اس تباہی و بربادی سے بچانے کی کوشش کرتا رہوں۔

گرام سوراجیہ سے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ گاؤں ایک ایسا مکمل جمہوریہ ہو جس کا اپنی اہم ضروریات کے لئے اپنے پڑوسیوں پر بھی انحصار نہ ہو اور پھر بھی بہت سی دوسری ایسی ضروریات کے لئے ایک دوسرے پر انحصار ہو جن کیلئے دوسروں پر انحصار ضروری ہے اس طرح ہر گاؤں کا پہلا فرض یہ ہوگا کہ وہ اپنی ضرورت بھر اناج اور کپڑے کے لئے کپاس خود پیدا کرے۔ اس کے پاس اپنے مویشیوں کے لئے چراگاہ اور گاؤں کے بالغوں اور بچوں کے لئے دل بہلانے اور کھیل کود کے میدان ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد بھی اگر ان کے پاس زمین فاضل ہو تو اس میں وہ فائدہ مند تجارتی فصلیں اگائیں لیکن ان میں افیون، گانجا، اور تمباکو وغیرہ کی کاشت نہیں ہونی چاہئے۔ ہر ایک گاؤں کو اپنا ایک تھیٹر، اسکول اور پبلک ہال رکھنا ہوگا۔ اس کے پاس اپنا پانی کا انتظام ہوگا۔ واٹر ورکس ہوگا جس سے گاؤں کے سبھی لوگوں کو پینے کا صاف پانی ملے گا۔ کنوؤں اور تالابوں پر پورا کنٹرول رکھ کر یہ کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ بنیادی تعلیم آخری درجہ تک لازمی ہوگی۔ جہاں تک ممکن ہو گاؤں کے سبھی کام امداد باہمی کی بنیاد پر انجام دیئے جائیں۔ آج کل جس طرح ذات پات کا اثر ہے ویسی ذات پات یا چھوت چھات اس میں نہیں ہوگی۔ عدم تشدد کے ذریعہ جس کے عدم تعاون اور ستیہ گرہ دو ہتھیار ہیں، دیہی سماج کا نظم و نسق چلے گا۔ گاؤں کی حفاظت کے لئے دیہی محافظ ہوں گے جنہیں لازمی طور پر گاؤں کی چوکیداری کا کام کرنا ہوگا۔

اس کے لئے گاؤں کے رکھے گئے رجسٹر سے باری باری لوگوں کا چناؤ کیا جائے گا۔ گاؤں کا نظم ونسق چلانے کے لئے ہر سال گاؤں کے پانچ افراد کی ایک پنچایت منتخب کی جائے گی کم از کم مقرر کی گئی قابلیت رکھنے والے بالغ عورتوں اور مردوں کو اس پنچایت کو منتخب کرنے کا حق ہوگا۔ ان پنچایتوں کو سب طرح کے ضروری اختیارات اور حقوق حاصل ہوں گے۔ چونکہ اس دیہی سوراجیہ میں سزا دینے کا مروجہ طریقہ نہیں ہوگا۔ لہذا یہ پنچایت عدلیہ، عاملہ اور قانون سازی تینوں حیثیتوں سے کام کرے گی۔ یہاں میں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس طرح کے گاؤں کا اپنے پڑوسی گاؤں کے ساتھ یا مرکز کے ساتھ اگر کوئی کام ہوا، تو کیا تعلق ہوگا۔ میرا مقصد دیہی سماج کا ایک خاکہ پیش کرنا ہے۔ اس میں انفرادی آزادی پر مبنی جمہوریت ہوگی۔ فرد ہی اپنی حکومت کا خالق ہے۔ عدم تشدد کا قانون اس کی ذات اور حکومت دونوں میں کارفرما ہوگا۔ وہ اور اس کا گاؤں ساری دنیا کی طاقت کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ گاؤں کے ہر ایک شخص کی زندگی کا سب سے بڑا اصول یہ ہوگا کہ وہ اپنی اور اپنے گاؤں کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے مر مٹے۔

لاتعداد گاؤں سے بنے اس ڈھانچے کا پھیلاؤ اوپر کی طرف نہیں ہوگا بلکہ اس کی شکل ایک بڑھتے ہوئے دائرے کی سی ہوگی۔ جس کی اونچائی کا سارا بار بنیادوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ایک اہرام کی طرح نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ پانی کے دائروں کی ہوگی جس کا مرکز فرد ہوگا۔ یہ فرد اپنے گاؤں کی خاطر اور ہر گاؤں دوسرے گاؤں کے لئے مر مٹنے کے لئے تیار ہوگا۔ اور آخر میں سارا سماج ایسے افراد کا بن جائے گا جو مغرور اور متکبر نہ ہوکر بہت منکسر المزاج ہوں گے۔ باہری گھیرا اپنے اندر کے دائروں کو کچلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ ان سب کو تقویت بخشے گا جو اس کے اندر ہیں اور پھر بھی خود ان

سے قوت حاصل کرے گا....... اس میں نہ تو کوئی پہلا ہوگا اور نہ آخری ..... اور اس میں ہر عورت و مرد کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اسے یہ بھی علم ہوگا کہ کسی بھی فرد کو کسی ایسی شے کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے جسے دوسرے لوگ ایک جیسی محنت کر کے حاصل نہیں کر سکتے۔

جہاں تک گاؤں کے لوگوں کا تعلق ہے ان کے باہری کھدرے پن کے اندر بڑا قدیم تمدن پوشیدہ ہے......... ان کے باہری گنوار پن کے اندر روحانیت کا گہرا سوتا موجود ہے۔ مغرب میں آپ کو ایسی کوئی چیز نہیں ملے گی۔ آپ گاؤں والوں کی اوپری تہہ کو ہٹا دیجئے اور ان کی مدتوں سے چلی آرہی غربی اور جہالت کو دور کر دیجئے تو آپ انہیں ایک آزاد متمدّن اور مہذب شہری کے روپ میں پائیں گے۔

(د) جمہوریت

بہترین قسم کی آزادی میں اعلیٰ ترین ڈسپلن اور انکساری ہوتی ہے۔ جو آزادی ڈسپلن اور انکساری کی دین ہوتی ہے اُسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ بے لگام آزادی خطرات سے پُر ہوتی ہے جس سے فرد کا اپنا اور اس کے پڑوسیوں دونوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔ جمہوریت میں پختہ اعتماد اور یقین رکھنے والا نظم و ضبط کا بھی سختی سے پابند رہتا ہے۔ اس کا مزاج قدرتی طور پر جمہوری ہوگا۔ میں اپنے مزاج اور تربیت دونوں لحاظ سے جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ جو لوگ جمہوریت کی خدمت کرنے کے متمنی ہیں انھیں سب سے پہلے جمہوریت کی اس کسوٹی پر کھرا اُترنا چاہئے اس کے علاوہ جمہوریت پسند کو بے غرض ہونا چاہئے۔ اُسے چاہئے کہ وہ جو کچھ بھی سوچے وہ اپنے آپ کو یا اپنی پارٹی کو نہیں۔ بلکہ جمہوریت کو ذہن میں رکھ کر سوچے، تبھی اُسے سول نافرمانی کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص اپنے اعتقادات چھوڑ دے یا اپنے جذبات کچل دے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ صحت مند اور حقیقی اختلافات سے ہمارے مقاصد کو نقصان پہنچے گا۔ مگر موقع پرستی، مکر و فریب اور غیر حقیقی سمجھوتوں سے بلا شبہ نقصان پہنچے گا۔ اگر آپ کسی بات سے متفق نہیں ہیں تو آپ کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ آپ کے خیالات آپ کے دلی اعتقادات کے ترجمان ہوں اور آپ کی پارٹی کے لئے نعرہ بازی کے لئے نہ ہوں۔

میں انفرادی آزادی کی قدر کرتا ہوں مگر آپ کو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ انسان لازمی طور پر ایک سماجی جانور ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو اجتماعی ترقی کی

ضروریات کے مطابق ڈھالنا سیکھ کر ہی اپنی موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔ پابندیوں سے مبرّا انفرادیت جنگل کے جانوروں کا قانون ہے۔ ہم نے انفرادی آزادی اور سماجی بندشوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنا سیکھ لیا ہے۔ سارے سماج کی بہتری و بہبود کے نقطۂ نظر سے سماجی بندشوں کو اپنی مرضی سے لاگو کرنے سے فرد اور سماج، جس کا وہ ایک رکن ہے دونوں کی بھلائی ہوتی ہے۔

انسان کا بنایا ہوا کوئی بھی اِدارہ ایسا نہیں جس میں اُس کے اپنے خطرے نہ ہوں۔ جتنا بڑا اِدارہ ہوتا ہے اُتنا ہی زیادہ اُس کے غلط استعمال کا امکان ہوتا ہے۔ جمہوریت ایک بہت بڑا اِدارہ ہے لہٰذا اس کا غلط استعمال بھی بہت ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کا علاج جمہوریت سے بچنا نہیں بلکہ اُس کے غلط استعمال کے امکان کو کم سے کم کرنا ہے۔

جمہوریت وہ فن اور سائنس ہے جس کے ذریعے سماج کے سبھی طبقوں کے لوگوں کی تمام مادّی، روحانی اور اقتصادی ذرائع کو سب کی عام بھلائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

مجھے سیاست میں آنے کے لئے اس لئے مجبور ہونا پڑا کیوں کہ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ سیاست میں داخل ہوئے بغیر میں سماجی خدمت تک نہیں کر سکتا میرے خیال میں سیاسی سرگرمیوں کو سماجی اور اخلاقی ترقی کی صورت اختیار کرنا چاہئے۔ جمہوریت میں زندگی کا کوئی بھی شعبہ سیاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا

حقیقی جمہوریت یا سوراجیہ جھوٹ اور عدمِ تشدّد کے بل بوتے پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ اِن طریقوں کے استعمال کا قدرتی نتیجہ

یہ ہوگا کہ مخالفین کو دبا کر یا اُن کو تباہ و برباد کر کے ساری مخالفت کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس سے انفرادی آزادی کو تقویت نہیں پہنچتی۔ دراصل انفرادی آزادی صرف سچے عدم تشدد میں ہی پنپ سکتی ہے۔

جمہوریت کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ اس میں کمزور سے کمزور اور طاقتور سے طاقتور کو یکساں موقع میسّر ہونا چاہئے۔ عدم تشدد کے سوا اور کسی طریقے سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ آج دُنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جو غریبوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اُن کے لئے جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، وہ مہربانی کے طور پر کیا جاتا ہے۔

جب تک اقتدار و قوت میں عوام کا حصہ نہیں ہوتا تب تک جمہوریت کا قیام ایک ناممکن بات ہے۔ لیکن جمہوریت کو روبہ تنزل کر کے اُسے غیر منظم بھیڑ کی حکومت نہیں بنا دینا چاہئے۔ اُس اچھوت یا مزدور کا بھی جو آپ کے لئے روزی پیدا کرنے میں امداد دیتا ہے، خودمختار حکومت میں حصہ ہونا چاہئے۔ لیکن آپ کو ان سے تعلقات رکھنے ہوں گے۔ اُن کے پاس جانا ہوگا۔ اُن کے گھروں کو دیکھنا ہوگا، جن میں وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی طرح بند رہتے ہیں۔ انسانوں کے اس حصے کی دیکھ بھال کرنا آپ کا فرض ہے۔ اُن کی زندگی بنانا یا بگاڑنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں اِن عام لوگوں کو تربیت دینی چاہئے۔ جن کا دِل سونے کا ہے، جو ملک کے دُکھ سکھ کو محسوس کرتے ہیں، جو کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اور رہنمائی چاہتے ہیں۔ ضرورت صرف تھوڑے سے سمجھدار اور ایمان دار لوگوں کی ہے اگر ایسے

کارکن مل جائیں تو پوری قوم کو اس طرح متحد کیا جاسکتا ہے کہ وہ سمجھداری سے کام کرے۔ غیر منظم مجمع کی حکومت میں سے جمہوریت کی نشو و نما کی جاسکتی ہے۔

اگر ہم حقیقی جمہوریت کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں تو ہم ناروادار نہیں ہو سکتے۔ ناروا داری اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہیں اپنے مقصد پر اعتماد نہیں ہے۔

اگر ہم دوسرے فریق کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو جمہوریت کی نشو و نما ممکن نہیں ہے جب ہم مخالفین کی بات سننے سے انکار کر دیتے ہیں یا اُسے سننے کے بعد اُن کا مذاق اڑاتے ہیں تو ہم ذہن و عقل کے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ جب تعصب ہماری عادت بن جاتا ہے تب سچائی کو کھو دینے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔
قدرت نے ہمیں جتنی عقل عطا کی ہے اور جہاں تک ہم اپنی راہنمائی کر سکتے ہیں وہاں تک ہمیں نڈر ہو کر کام کرنا چاہیے اور دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھنے چاہئیں نیز اس بات کو ماننے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ کہ ہم جس بات کو سچائی سمجھتے تھے وہ آخری سچائی نہیں تھی۔ اس طرح دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھنے سے سچائی کو تقویت پہنچتی ہے اور اُس میں اگر کوئی کمی ہوگی تو اُسے بھی ختم کر دیتی ہے۔

میں نے بارہا یہ بات دہرائی ہے کہ کسی بھی نظریے کے لوگ یہ دعوے نہیں کر سکتے۔ کہ اُن کے خیالات بالکل صحیح ہیں۔ ہم سب لوگ غلطی کر سکتے ہیں اور ہمیں اکثر اپنے فیصلے بدلنے پڑتے ہیں۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں سبھی صحیح نظریات کو جگہ ملنی چاہیے لہٰذا ہمارا اپنے تئیں اور دوسروں کے تئیں کم از کم اتنا فرض ضرور ہے کہ ہم اپنے مخالفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اگر ہم اُسے تسلیم نہیں کر سکتے تو اُس کا اتنا ہی احترام کریں جتنا ہم اُن سے اپنے نقطۂ نظر کے احترام کی

توقع کرتے ہیں۔

سچی جمہوریت مرکز میں بیٹھے ہوئے بیس آدمی نہیں چلا سکتے۔ وہ تو نیچے سے ہر گاؤں کے عوام کے ذریعے چلائی جانی چاہئے۔

کوئی بھی حکومت مکمل طور پر عدم تشدد پر کاربند نہیں رہ سکتی کیونکہ وہ تمام لوگوں کی نمایندگی کرتی ہے۔ میں اس طرح کے سنہری زمانے کا ابھی تصور نہیں کرتا۔ میں ایک ایسے سماج میں ضرور یقین رکھتا ہوں جس میں عدم تشدد کو فوقیت حاصل ہو اور میں ایسے سماج کے قیام کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔

زیادہ تر لوگ حکومت کی پیچیدہ مشینری کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہر شہری اپنے وقت کی حکومت کو قائم رکھنے میں متعدد طریقوں سے جن کی اُسے واقفیت بھی نہیں ہوتی، ——— یقیناً اہم رول ادا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر شہری اپنی حکومت کے ہر کام کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جب تک حکومت کے کام قابلِ برداشت ہوں اُس کی حمایت کرنی چاہئے۔ مگر جب اس کے کاموں سے اُسے (شہریوں کو) اور اس کی قوم کو نقصان پہنچنے لگے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اُس کی حمایت کرنا بند کر دے۔

ریاست کے حقوق میں اضافہ ہوتے دیکھ کر میں بے حد فکرمند ہو جاتا ہوں کیونکہ باہر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ استحصال کو کم از کم کر کے سماج کی بھلائی کر رہا ہے مگر اصل میں وہ انفرادیت کو جو ہر طرح کی ترقی کی جڑ ہے، تباہ کر کے بنی نوع انسان کا سب سے زیادہ نقصان کرتا ہے۔

میرے لئے فرد کے تئیں چاہے وہ پسماندہ سے پسماندہ ہو، انصاف ہی سب کچھ ہے۔ دیگر سب باتیں بعد میں آتی ہیں۔

اگر فرد کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی تو سماج میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے! انفرادی آزادی ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنی مرضی سے سماج کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کر دینے کی ترغیب و تحریک دے سکتی ہے۔ اگر اُس سے یہ آزادی چھین لی جاتی ہے تو وہ ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے اور سماج تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ انفرادی آزادی ختم کر کے کسی بھی سماج کی تعمیر ممکن نہیں ہے.

عوام کے سوراجیہ کے معنی ہیں، افراد کا سوراجیہ اور اس طرح کا سوراجیہ تب حاصل ہوتا ہے جب تمام افراد اپنے شہری ہونے کے فرائض انجام دیں۔ اس میں کوئی بھی شخص اپنے حقوق کے بارے میں نہیں سوچتا۔ حقوق تو اُس وقت آتے ہیں جب اُن کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے حصول کے بعد فرد اپنے فرائض کو اچھی طرح نبھا سکے۔

جو شخص اپنے فرائض اچھی طرح نبھاتا ہے اُسے حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ دراصل اپنے فرائض کی انجام دہی کا حق ہی ایسا واحد حق ہے جس کے لئے زندہ رہا جا سکتا ہے اور جس کے لئے زندگی بھی نچھاور کی جا سکتی ہے۔ اس کے ذریعے سبھی مناسب و جائز حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور سب حقوق کسی نہ کسی شکل میں غصب کئے جاتے ہیں اور اُن میں تشدد کے بیج نہاں ہوتے ہیں۔

حقوق حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ فرض کی ادائیگی ہے اگر ہم سب لوگ اپنے اپنے فرض کو نبھائیں تو حقوق آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے فرض کے پیچھے دوڑیں گے تو سراب کی مانند وہ ہم سے دُور ہو جائیں گے۔ یہ تعلیم شری

کرشن نے ان غیر فانی الفاظ میں دی ہے۔

"عمل فرض ہے اور حق اُس کا پھل"

جہاں اُوپر سے لادی گئی طاقت کو پولیس اور فوج کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے، وہاں اندر سے پیدا ہوئی طاقت کو اُن کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔

طاقت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک سزا کے خوف سے حاصل کی جاتی ہے اور دوسری پیار و محبت کے عمل سے پیار پر مبنی طاقت سزا کے خوف کے ذریعے حاصل طاقت کی بہ نسبت ہزار گنا زیادہ موثر اور مستقل ہوتی ہے۔

باپ کا اپنے بچوں پر حق ہوتا ہے۔ وہ اُنہیں سزا بھی دے سکتا ہے، لیکن تشدد کا استعمال سب سے زیادہ موثر تب ہوتا ہے جب وہ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ طاقت کا اگر صحیح ڈھنگ سے استعمال کیا جائے تو وہ انہیں بوجھ نہیں معلوم ہوگی، بلکہ پھول کی طرح ہلکی محسوس ہوگی۔"

میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کے اصول میں یقین نہیں رکھتا کیوں کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۵۱ فی صد لوگوں کی مفروضہ بھلائی کے لئے ۴۹ فی صد لوگوں کے مفاد کی قربانی کی جاسکتی ہے یا کی جانی چاہئے۔ یہ بڑا کٹھور اصول ہے اور اُس سے انسانیت کو نقصان پہنچا ہے۔ سب لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی ہی ایک واحد سچا اور اعلیٰ انسانی اصول ہے اور اسے سب سے اعلیٰ قربانی کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جمہوریت کے اس دور میں یہ ضروری ہے کہ عوام کی اجتماعی کوشش کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جائیں۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ ایک بہت طاقتور

فرد کے ذریعے بھی مقصد کی تکمیل ہوسکتی ہے، لیکن اس سے عوام کو اپنی اجتماعی قوت کا احساس نہیں ہوگا، ایک فرد کی کامیابی ایک کروڑپتی کے ذریعے لاکھوں بھوکوں کو مفت کھانا بانٹنے جیسا اقدام ہوگا۔ لہٰذا ہم لوگوں کو اپنی قوت تعمیری کاموں کی تکمیل میں لگانا چاہیئے۔

جس کام کو لاکھوں کروڑوں افراد مل کر کرسکتے ہیں، اس میں ایک لاثانی اور غیر معمولی طاقت آجاتی ہے۔

داموں کے بڑھنے کی بات مجھے خوفزدہ نہیں کرتی۔ اگر ہمارے درمیان بہت سے آدم خور موجود ہیں اور ہمیں اُن کا مقابلہ کرنا نہیں آتا تو ہم اس قابل ہیں کہ یہ ہمیں نگل جائیں۔ تب ہمیں پتہ چلے گا کہ مصیبت کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیئے۔ لوگوں کو حقیقی جمہوریت کی تعلیم نہ تو کتابوں سے ملتی ہے اور نہ حکومت سے، جو کہ نام کے لحاظ سے بھی اور اصلیت کے لحاظ سے بھی اُن کی خادم ہے۔ جمہوریت کی سب سے اچھی تعلیم تجربے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

جمہوریت میں بزدلی کا کوئی مقام نہیں ہے، عام طور پر جب لوگ کسی بات پر یقین رکھتے ہیں اور اس کا مطالبہ کرتے ہیں، تب اُن کے نمائندوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اُن کا مطالبہ پورا کریں۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں نے جب کبھی جرارتمندانہ رویہ اپنایا ہے تو اس سے لڑائیاں جیتنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

اگر ہم اپنے آپ سے یہ کہنے لگیں کہ اب تو سوراجیہ حاصل ہوگیا ہے اور اب ہم بےفکر ہوکر بیٹھ سکتے ہیں تو ہم ملک کا بڑا نقصان کریں گے۔ ... اب تک لوگوں

کی ساری طاقت برطانوی سرکار کے خلاف لڑائی لڑنے میں لگی تھی۔ اب اُسی طاقت کو قوم کو خوشحال اور طاقتور بنانے میں لگانا چاہیئے، نہیں تو وہ اُلٹ کر ہمارے اُوپر آپڑے گی اور ہمارے اندر پھوٹ اور نفاق پیدا کرے گی۔

اگر عام لوگ آزادی کا لُطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے خود اپنی مرضی سے ڈسپلن میں رہنا سیکھنا ہوگا۔ ورنہ جو بھی سرکار ہوگی اُسے زبردستی ڈسپلن پر عمل کرانا ہوگا۔ ایسی آزادی، آزادی نہیں بلکہ غلامی ہوگی۔ ہر ملک میں عوام کو ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کے وہ لائق ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہلّڑ بازی کریں گے تو حکومت اور اس کے افسران بھی قانون اور نظم و نسق کے نام پر ویسا ہی کریں گے۔ اس کا نتیجہ آزادی اور خودمختاری نہیں بلکہ طوائف الملوکی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فریقین ایک دوسرے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اجتماعی آزادی کی پہلی ضرورت ہے اپنی مرضی سے ڈسپلن کی پابندی۔ اگر ہم لوگوں کا برتاؤ مہذّبانہ ہوگا، تو سرکاری افسران سچے خدمت گار بن جائیں گے ورنہ وہ ہماری گردن پر سوار ہو جائیں گے جو مناسب بھی نہیں ہوگا۔

اگر رہنما اور کارکن وقت کی پابندی پر سختی سے عمل کریں تو اُس سے قوم کو کافی فائدہ پہنچے گا۔ کسی بھی شخص سے، جتنا کام وہ کرسکتا ہے، اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاتی۔ اگر دن کے خاتمے پر کچھ کام بچ رہتا ہے یا کوئی کارکن اپنی ایک وقت کی خوراک چھوڑے بغیر یا اپنے عیش و آرام کے وقت کی کٹوتی کئے بغیر اپنا کام پورا نہیں کر پاتا تو اس کا مطلب ہے کہ کہیں نہ کہیں بدانتظامی ہے۔ مجھے اس میں شبہ نہیں کہ اگر ہم اپنا کام وقت پر کرنے کی عادت ڈال لیں اور مقررہ

پروگرام کے مطابق کام کریں تو قومی کارگذاری میں اضافہ ہو جائے گا اور ہم اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھیں گے اور کارکن نسبتاً زیادہ صحت مند اور طویل عمر پائیں گے

ہمارا اخلاقی معیار اتنی تیزی سے رو بہ تنزل ہے کہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ ماضی میں ہماری ستیہ گرہ کی لڑائیوں میں سچے جذبات کی کمی کیوں تھی اور وہ کمزوروں کا ستیہ گرہ بن کر کیوں رہ گئی تھی۔

اسی لئے میں نے کہا ہے کہ جو شخص تمام حالات میں نیک بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اور نیک کام کرتے رہنا چاہتا ہے۔ اُسے کبھی طاقت و اقتدار حاصل نہیں کرنا چاہئے۔

سرکاری خزانے میں جو روپیہ ہے وہ ہندوستان کے غریب عوام کا ہے جن سے زیادہ غریب لوگ اس دنیا میں اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ ہمیں نسبتاً زیادہ بیدار، اور محتاط اور ہوشیار رہنا چاہئے اور ہمیں عوام سے ملنے والی ہر پائی کا حساب دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔

اگر ہم ہر ایک پائی کا جو ہمیں ملتی ہے، حساب نہیں رکھتے اور روپے کا صحیح استعمال نہیں کرتے تو ہم اس قابل ہیں کہ ہمیں عوامی خدمت کے میدان سے باہر نکال دیا جائے۔

تمام عوامی اداروں کا بنک عوام ہی ہونے چاہئیں اور عوام کی مرضی کے خلاف اُنہیں ایک دن بھی قائم نہیں رہنا چاہئے۔ جو ادارہ جمع شدہ پونجی کے سُود پر چلتا ہے، وہ رائے عامہ کے سامنے نہیں جھکتا اور مطلق العنان ہو جاتا ہے اور اپنے ہر کام کو صحیح خیال کرنے لگتا ہے۔

متعدد عوامی اداروں سے مجھے جو تجربہ ہوا ہے اور اس سے میرا یہ یقین اور پختہ ہوگیا ہے کہ مستقل فنڈ کے سے عوامی اداروں کو چلانا اچھا نہیں ہوتا۔ مستقل فنڈ میں ادارے کی گراوٹ اور تنزل کے بیج نہاں ہوتے ہیں۔ عوامی ادارے کے معنی ہیں ایسا ادارہ جو عوام کی منظوری اور عوام کے سرمایے کے ذریعے چلایا جائے۔ اس طرح کے ادارے کو جب عوام کی امداد ملنا بند ہو جاتی ہے تو اُسے قائم رہنے کا حق نہیں رہ جاتا۔ جن اداروں کو مستقل سرمایے کے ذریعہ چلایا جاتا ہے وہ اکثر رائے عامہ کو نظر انداز کرتے دیکھے گئے ہیں۔ اس کا تجربہ ہمیں اپنے ملک میں ہر قدم پر ہوتا ہے۔ کچھ نام نہاد مذہبی اوقاف نے حساب کتاب رکھنا ہی بند کر دیا ہے۔ متوتی مالک بن بیٹھے ہیں اور وہ کسی کو جوابدہ نہیں ہیں۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ عوامی اداروں کا وجود، فطرت کی طرح اُن کے روز بروز کے کام پر منحصر ہونا چاہئے۔ جس ادارے کو عوام کی حمایت حاصل نہ ہو، اُسے قائم رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

(د) چھوت چھات

یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ آج ہمارے لئے مذہب کے معنی کھانے پینے پر پابندی اور چھوٹے بڑے کے فرق کو ماننے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میں آپ کو بتادوں کہ اس سے بڑھ کر ناسمجھی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ پیدائش یا مذہب کے ظاہری رسوم کی بنیاد پر کسی کی برتری یا کمتری کا انحصار نہیں ہو سکتا۔ اس کا فیصلہ صرف اُس کے کردار کی بنا پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے انسان کو چھوٹا یا بڑا نہیں

بنایا۔ کوئی بھی مذہبی کتاب جو کسی انسان کو اس کی پیدائش کی بنا اچھوت یا ہیچ قرار دیتی ہے۔ ہماری عقیدت کے قابل نہیں۔ یہ بات خدا اور سچائی کو جو خدا ہے ماننے سے انکار کرنا ہے۔

آج ہندو مذہب پر ایک امٹ کلنک لگا ہوا ہے۔ میں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ یہ کلنک زمانہ قدیم سے لگا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھوت چھات کے افسوسناک، نفرت انگیز اور غلامانہ جذبات ہمارے اندر اسی وقت آئے جب ہم سب سے زیادہ گراوٹ کی طرف آئے۔ اس بدعت نے ہمارے اندر گھر کر لیا ہے اور اب ہمارے اندر یہ پنپ رہی ہے۔

آج ہندو مذہب میں جس طرح چھوت چھات برتا جاتا ہے وہ میرے خیال میں خدا اور انسان دونوں کے تئیں گناہ ہے اور ایسا زہر ہے جو آہستہ آہستہ ہندو مذہب کی قوتِ حیات کو ختم کئے جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اگر پورے ہندو شاستر کو دیکھا جائے تو اس سے چھوت چھات کی کہیں بھی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس برائی نے اونچی ذات والوں اور اچھوتوں دونوں کو گراوٹ کا شکار بنایا ہے۔ اس کی وجہ سے لگ بھگ چار کروڑ افراد کی ترقی کے راستے بند ہیں۔ انہیں زندگی کی عام سہولیات بھی میسر نہیں۔ لہٰذا چھوت چھات جتنی جلدی ختم ہو جائے، اتنا ہی یہ ہندو مذہب کے لئے، ہندوستان کے لئے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے اچھا ہوگا۔

جہاں تک چھوت چھات سے میرا تعلق ہے میرے خیال میں یہ ہندو مذہب کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے۔ اگر چھوت

بھات کا جذبہ اُسی طرح پنپتا رہا تو نہ صرف ہندو مذہب بلکہ سارا ہندوستان تباہ
و برباد ہو جائے گا اور اگر ہندوؤں کے دل و دماغ سے چھوت چھات کا نام و
نشان مٹا دیا جاتا ہے تو وہ بلاشبہ دُنیا کو ایک واضح پیغام دے سکتا ہے۔
پہلی بات میں نے سیکڑوں جلسوں میں کہی ہے لیکن دوسری بات نہیں کہی۔ اب
یہ ایک ایسے شخص کا کہنا ہے جو سچائی کو خدا مانتا ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی مبالغہ
آمیزی نہیں ہے۔ اگر چھوت چھات ہندو مت کا جزو ہے تو یہ بے جان اور
ناکارہ مذہب ہے۔ چھوت چھات کے خلاف تحریک چلانے کے پیچھے میرا جو
مقصد ہے، وہ عیاں ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ہر ہندو اچھوتوں کو چھونے لگے
بلکہ یہ ہے کہ ہر ہندو چھوت چھات کو اپنے دل سے نکال دے اور مکمل طور سے
اس کے دل میں تبدیلی پیدا کی جائے۔

خود غرضی کی بنیاد پر اپنے کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا سمجھنا بہت بُری
بات ہے لیکن جب چھوت چھات کو ہم مذہب کے ساتھ وابستہ سمجھ لیتے ہیں
تو یہ اور بھی غلط بات ہو جاتی ہے۔ نیز جب عالم اور پنڈت چھوت چھات ایسی
رعت کو مناسب اور جائز ثابت کرنے کے لئے شاستروں کی پناہ لیتے ہیں تو مجھے
بے حد دُکھ ہوتا ہے۔ میں نے یہ بات پہلے بھی کہی ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ ہم ہندو امتحان کی
گھڑی سے گذر رہے ہیں۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں چھوت چھات ختم ہو ہی رہا ہے۔ لیکن اس
امتحان کی گھڑی میں اگر اس گناہ کا کفارہ ادا کریں، اپنی اصلاح کریں اور اپنے کو پاک
باطن بنائیں تو تاریخ میں ہندوؤں کے اس کارنامے کا ذکر ایک اعلٰے ترین نیک کام کی حیثیت
سے کیا جائے گا لیکن اگر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی خواہشات کے خلاف

اس بات کے لئے مجبور ہونا پڑا اور ہریجنوں نے اپنے حقوق خود حاصل کر لئے تو یہ بات نہ تو ہندوؤں کے لئے اور نہ ہی ہندو مذہب کے لئے قابلِ تحسین ہوگی۔ لیکن میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اگر ہم امتحان میں ناکام ہو گئے تو ہندو اور اُن کا مذہب دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ہری جن کے معنی ہیں 'بندۂ خدا'۔ دُنیا کے تمام مذاہب خدا کو بے یار و مددگار کا یار اور مددگار اور کمزوروں کا محافظ بتاتے ہیں۔ باقی دُنیا کی بات تو چھوڑیئے۔ ہندوستان کے چار کروڑ یا اُس سے زیادہ اُن ہندوؤں سے بڑھ کر اور کون بے یار و مددگار اور کمزور ہوگا جنہیں اچھوت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی آدمی کو صحیح معنوں میں "ہری جن" کہا جا سکتا ہے تو بلا شبہ وہ بے یار و مددگار اور کمزور لوگ ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے 'نوجیون' کے صفحات میں اچھوتوں کے لئے ہمیشہ 'ہری جن' کا لفظ استعمال کیا ہے نام بدل دینے سے کسی کی سماجی حالت تو بدل نہیں جاتی مگر کسی کے لئے ایسے لفظ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے جو اُس کے لئے باعثِ ننگ ہو۔ جب سورن ہندو اپنے دلی عقیدے کی وجہ سے اور مرضی سے موجودہ چھوت چھات سے چھٹکارا پالیں گے۔ تب ہم سب لوگ ہری جن کہلائیں گے۔ کیونکہ میری حقیر رائے میں اسی وقت سورن ہندوؤں پر خدا کی لطف و مہربانی ہوگی اور وہ صحیح معنوں میں اس کے بندے کہلا سکیں گے۔

ہری جنوں کی خدمت ایک مذہبی فرض ہے۔ اس میں چالاکی اور عیاری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اُسے مکمل طور پر عدم تشدد اور سچائی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ یہ خدمت صرف قربانی اور گناہ کا کفارہ ادا کر کے ہی کی جا سکتی ہے۔ مجھے اس بات میں شک ہے کہ بغیر تزکیہ نفس کے ہم ہری جنوں کا اعتماد حاصل کر سکیں گے۔ اگر وہ آج ہمارے ہر

کام کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اب تک ہم اُن کے کندھوں پر سوار رہے ہیں۔ اگر ہمیں اُن کے ساتھ انصاف کرنا ہے تو ہمیں اُن کے اُوپر سے اپنا بوجھ اُتار لینا چاہیئے اور اُنہیں ویسا ہی سمجھنا چاہیئے جیسا کہ ہم دیگر ہندؤوں کو سمجھتے ہیں۔

ہری جنوں کی مالی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانا بلاشبہ سورن ہندؤوں کے کفارے کا ایک حصہ ہے یہ اُن کے عقیدے کی ایمانداری کی ایک کسوٹی ہے۔ لیکن یہ بہتری اور بہبود کا کام تب تک پورا نہیں ہوگا جب تک کہ ہری جنوں کے لئے مندروں کے دروازے کھول نہیں دیئے جاتے۔ مندروں کا کھولنا ہری جنوں کی مذہبی برابری کا اعتراف کرنا ہوگا اور بلاشبہ یہ اقدام اس بات کا مظہر ہوگا کہ اب وہ ہندو مذہب سے الگ تھلگ نہیں رہیں گے جیسا کہ وہ آج ہیں۔

اور جب ہری جنوں کے لئے مندر کھول دیے جائیں گے تب اسکول، کنویں اور اس طرح کی بہت سی دیگر سہولیات بھی خود بخود اُنہیں حاصل ہو جائیں گی۔

اس وقت ہری جنوں کو جتنی تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُنہیں ایک مقررہ مدت میں مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے ایک زوردار مہم شروع کرنی چاہیئے۔ ہری جنوں کی بہتری و فلاح کے کام کو مزید غیر معین عرصہ تک کے لئے ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔ آزادی کی طرح اُسے ابھی اور فوراً تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر سماج کا یہ اہم اور کارآمد حصہ اپنے ضروری حقوق سے محروم رہ جاتا ہے تو خود آزادی کا لطف بھی پھیکا پڑ جائے گا۔

سوراجیہ میں اس طرح کا کوئی کلنک باقی نہیں رہے گا کہ ہری جن لوگ مندروں

میں نہ جا سکیں جب کہ دُوسرے ہندوؤں کو اُن میں جانے کی اجازت ہو۔ ویدوں اور شاستروں کے احکام سے انحراف و انکار نہیں کیا جائے گا مگر اُن کی تشریح و توضیح کسی فرد پر نہیں چھوڑی جائے گی بلکہ قانونی مقاصد کو مدنظر رکھا جائے گا تاکہ یہ کتابیں عوامی کردار میں انضباط پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جا سکیں لوگوں کے جذبات کا احترام کیا جائے گا مگر دوسروں کے حقوق اور اخلاقِ عامہ کو نقصان پہنچا کر نہیں۔ جو لوگ غیر معمولی طور پر احتیاط برتنا چاہیں گے اُنہیں خود تکلیف ہوگی، اور انہیں اپنے ایسے خیالات کی قیمت چکانی پڑے گی۔ قانون یہ کبھی گوارا نہیں کرے گا کہ کوئی شخص یا طبقہ رسم و رواج یا مذہب کے نام پر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھے۔

ہری جنوں کی جس حقیقی بھوک کو مٹانے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ معزز شہری کے طور پر اچھی طرح زندگی بسر کریں۔ انسان ہونے کے ناتے اُن سے مناسب سلوک کیا جائے۔ ہر قسم کے خوف و خدشے سے اُنہیں نجات ملے، اُنہیں صاف ستھرا رہنے کی عادت ڈالی جائے، نیز اُنہیں محنت، تعلیم اور کفایت شعاری سے روشناس کیا جائے۔ اس کے لئے ہمیں لگن، صبر و تحمل اور سُوجھ بُوجھ سے کام لینا ہوگا۔ اگر آپ مجھے ہری جنوں کو کھانا کھلانے کے لئے روپیہ دیتے ہیں تو میں اُسے ٹھکرا دوں گا کیوں کہ میں اُنہیں بھکاری اور کاہل نہیں بنانا چاہتا۔

میرا یقین ہے کہ اگر چھوت چھات کی مکمل بیخ کنی کر دی جائے تو اس سے ہندو مذہب کا ایک کلنک ہی نہیں مِٹ جائے گا، بلکہ اس کا عالمگیر اثر ہوگا۔ چھُوت چھات کے خلاف میری جدوجہد انسانیت میں پیدا ہونے والی برائیوں

اور خامیوں کے خلاف جدوجہد ہے۔

مجھے اپنی زندگی کا تجربہ بہت اچھی طرح یاد ہے یہ میرے چھوت چھات ختم کرنے کے لیے رکھے گئے ۲۱ دن کے برت سے متعلق ہے۔ برت سے پہلی رات کو جب میں سونے کے لیے گیا تو مجھے اس بات کا رتی بھر خیال نہیں تھا کہ اگلے دن مجھے برت کا اعلان کرنا پڑے گا۔ رات بارہ بجے کسی شے نے مجھے اچانک جگا دیا اور کسی آواز نے، کہہ نہیں سکتا کہ وہ آواز اندرونی تھی یا بیرونی، سرگوشی کی، "تمہیں برت رکھنا چاہیئے" "کتنے دن؟" میں نے سوال کیا۔ اُس آواز نے دوبارہ کہا "۲۱ دن" "وہ کب سے شروع کرنا چاہیئے؟" میں نے پوچھا۔ اُس آواز نے اس کا جواب دیا۔ "تم کل سے ہی شروع کردو۔" میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد چپ چاپ سو گیا۔ صبح کی پرارتھنا کے وقت تک میں نے اپنے ساتھیوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کے بعد میں نے اُن کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا رکھ دیا جس میں میں نے برت کا اعلان کیا تھا اور اُن سے کہا تھا کہ وہ اس بارے میں مجھ سے بحث مباحثہ نہ کریں کیونکہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اس برت سے میں زندہ نہیں بچوں گا۔ لیکن میرے اندر کی کوئی شے مجھے برابر کہہ رہی تھی کہ میں زندہ رہوں گا۔ اور مجھے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس طرح کا کوئی تجربہ مجھے اپنی زندگی میں اس سے پہلے نہیں ہوا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی ہوا۔

(س) — عورتیں

عورت مرد کی ساتھی ہوتی ہے۔ اور اُسے وہی ذہنی اور شعوری صلاحیتیں حاصل

ہیں جو مرد کو حاصل ہیں۔ اُسے مرد کی تمام سرگرمیوں میں مکمل طور پر حصّہ لینے کا حق حاصل ہے اور اُسے بھی آزادی اور خود مختاری کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مرد کو ہے۔ اُسے اپنے حلقہ میں وہی اعلیٰ مقام حاصل ہے، جو مرد کو اپنے حلقے میں ہے۔ عورت کی اس حیثیت کو اس وجہ سے نہیں تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ وہ پڑھنا لکھنا جانتی ہے بلکہ اُسے اس کا فطری حق حاصل ہونا چاہیئے۔ صرف بُرے رسم ورواج کی وجہ سے ہی نااہل اور جاہل مردوں کو عورتوں سے اعلیٰ رتبہ حاصل ہے جس کے نہ تو وہ اہل ہیں اور جو نہ ہی انہیں ملنا چاہیئے۔

عورت عدم تشدّد کا مجسمہ ہے۔ عدم تشدّد کا مطلب ہے انتہائی محبت و شفقت، یعنی تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی غیر معمولی قوت۔ کوئی اور نہیں صرف عورت، مرد کی جننی (جنم دینے والی) میں یہ قوت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے کو نو ماہ تک اپنے پیٹ میں رکھ کر اُس کی پرورش کرتی ہے اور اس تکلیف میں مسرت محسوس کر کے اپنی اس صلاحیت کا ثبوت دیتی ہے۔ زچگی کی تکلیف سے زیادہ تکلیف اور کیا ہو گی۔؟ مگر اس تخلیق کی مسرت میں وہ یہ سب تکلیف بھول جاتی ہے۔ اپنے بچے کی روزانہ نشوونما کے لئے ہر روز کون اتنی تکلیف برداشت کرتا ہے؟ اُسے اپنی اس محبت کو تمام بنی نوع انسان کی محبت کے لئے وقف کر دینا چاہیئے اور اس بات کو فراموش کر دینا چاہیئے کہ کبھی وہ مرد کی جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ تھی یا ہو سکتی ہے اور تب اُسے مرد کی جننی، خالق اور خاموش رہنما کی حیثیت سے مرد کے برابر خود دارانہ اور قابلِ فخر مقام حاصل ہو گا۔

میرا یقین ہے کہ جس طرح وحشی پن میں مرد عورت کی نسبت زیادہ پیش پیش ہے اسی طرح قربانی کے جذبے میں عورت مرد سے بہت آگے ہے۔

عورتوں کو کمزور کہنا اُن کی بے عزتی کرنا ہے۔ مرد کا ایسا کہنا عورت کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ اگر طاقت کے معنی وحشی پن ہے تو یقیناً عورت مرد کی نسبت کم وحشی ہے اور اگر طاقت سے مراد اخلاقی قوت ہے تو بلاشبہ عورت مرد سے زیادہ طاقتور ہے۔ کیا اس میں مشاہدۂ ذات زیادہ نہیں ہے ؟ کیا اُس میں قربانی کا جذبہ زیادہ نہیں ہے ؟ کیا اُس میں قوتِ برداشت زیادہ نہیں ہے ؟ اور کیا اُس میں حوصلہ و جرأت زیادہ نہیں ؟ اُس کے بغیر مرد کا وجود نہیں ہے۔ اگر ہم عدم تشدد پر کاربند ہوں تو مستقبل عورت کا ہے۔

اگر میں عورت ہوتا تو مرد کے اس جھوٹے دعویٰ کے خلاف کہ عورت مرد کی عیاشی کا ذریعہ ہے، بغاوت کر دیتا۔ میں ذہنی طور پر عورت بن گیا ہوں جس سے کہ میں اُس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ سکوں۔ میں اپنی بیوی کے دل میں اس وقت تک جگہ نہیں پاسکا جب تک کہ میں نے اس کے تئیں اپنے برتاؤ کو بدل لینے کا تہیہ نہیں کر لیا۔ لہٰذا میں نے وہ تمام نام و نہاد حقوق ترک کر دیے جو شوہر ہونے کے ناتے مجھے حاصل تھے اور اس کے ساتھ ہی بیوی کے سارے حقوق میں نے اُسے دے دئیے۔

مرد نے جتنے بھی گناہ کئے ہیں اُن میں سے سب سے زیادہ تحقیر آمیز، ہیبتناک اور وحشیانہ اقدام اپنی بیوی کے ساتھ بُرا سلوک کرنا ہے۔ وہ صرف جنسِ لطیف ہے نہ کہ جنسِ لطیف۔ مرد اور عورت دونوں میں سے آج بھی عورت زیادہ قابلِ احترام ہے کیونکہ وہ آج بھی قربانی، عاجزی، انکساری یقین اور علم کی دیوی ہے۔

زندگی میں جو بھی پاکیزگی اور مذہبیت ہے۔ اس کی عورت محافظ وامین ہے فطرتاً قدامت پرست ہونے کی وجہ سے اگر وہ کورانہ عقیدت سے جلد چھٹکارا نہیں پا سکی تو وہ زندگی میں پاکیزگی اور شرافت کو بھی دیر سے ترک کرتی ہے۔

یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ سمرتیوں میں ایسے متن ہیں جن کو وہ لوگ عزت واحترام کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ ہیں جو اپنی آزادی کی طرح عورت کی آزادی کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور اُسے مادرِ ملت خیال کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سمرتیوں میں ایسے متن بھی ہیں جو عورت کو اس کے شایانِ شان رتبہ عطا کرتے ہیں اور انہیں بہت عزت و احترام بخشتے ہیں۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان متون کا کیا کیا جائے جس میں ایسی باتیں کہی گئی ہوں جو انہیں دوسرے سمرتیوں کے متون میں کہی گئی باتوں سے متضاد ہیں اور جو اخلاقی شعور واحساس کے بھی خلاف ہے۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ شاستروں کے نام پر جتنی چیزیں شائع ہوئی ہیں، اُن سب کو الہام یا خدائی بات کے طور پر تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہر شخص اس بات کا فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کون سی بات اچھی یا مستند ہے اور کون سی بری اور اضافہ شدہ ہے، لہٰذا کوئی ایسا مستند ادارہ ہونا چاہیے جو ان کتابوں کی جو شاستروں کے نام سے موسوم کی جائیں، ترمیم کرے اور اُن میں سے اُن متنوں کو نکال دے جن کی کوئی اخلاقی اقدار نہیں، یا جو مذہب اور اخلاق کی بنیادوں کے منافی ہیں اور اس طرح ہندوؤں کی رہنمائی کے لیے کارآمد ایڈیشن شائع کرے۔ اگرچہ یہ یقینی ہے کہ تمام ہندو اور وہ لوگ جو مذہبی رہنما مانے جاتے ہیں، اس طرح کے ترمیم شدہ شاستروں کی حیثیت کو تسلیم نہیں کریں گے، پھر بھی اس مقدس کام میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

سنجیدگی سے دُور خدمت کی غرض سے کئے گئے کام کا آخرکار اثر پڑے گا اور اُس سے اُن
لوگوں کو ضرور مدد ملے گی جن کو اس کی بے حد ضرورت ہے۔

ہندو تمدن نے عورت کو مرد کا پورا غلام بناکر اور مرد کو زیادہ حقوق دیکر
اس بات پر زور دیا ہے کہ عورت کا مرد کے بغیر کوئی وجود نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے
کہ کبھی کبھی شوہر ایسے حقوق ہتیا لیتا ہے اور اُس کا استعمال کرتے کرتے وہ وحشی
بن جاتا ہے۔

عورتوں کو حقوق دینے کے بارے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ میری
رائے میں عورتوں پر کوئی بھی ایسی قانونی پابندی نہیں ہونی چاہئے جو مردوں پر
لاگو نہ ہو۔ میں لڑکے اور لڑکی کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنے کا حمایتی ہوں۔ عورتوں
میں جیسے جیسے تعلیم کا فروغ ہوگا، ویسے ویسے انہیں اپنی قوت کا احساس ہوتا جائیگا۔
اُنہیں اس کا احساس ہونا چاہئے اور اُس وقت وہ نابرابری سے سلوک کی قدرتی
طور پر مخالفت کرنے لگیں گی۔

اگر شوہر دیوتا ہے تو بیوی بھی دیوی ہے۔ وہ خادمہ نہیں بلکہ دوست اور
ساتھی ہے جس کے حقوق برابر ہیں۔ میاں بیوی دونوں ایک دُوسرے کے گرو ہیں
بیٹی کا حصہ بیٹے کے برابر ہونا چاہئے۔ شوہر کی کمائی میاں بیوی دونوں کی مشترکہ
ملکیت ہے کیونکہ شوہر بیوی کی امداد سے چاہے وہ رسوئی کا ہی کام کرتی ہو، دولت
کماتا ہے۔

اگر شوہر بیوی کے ساتھ ظلم کرتا ہے تو بیوی کو علیحدہ رہنے کا حق حاصل ہے۔
بچّوں پر دونوں کے حقوق مساوی ہیں۔ بچوں کے بڑے ہو جانے پر اُن

کے یہ حقوق ختم نہیں ہو جاتے۔ اگر ماں باپ میں سے کوئی بھی اِن حقوق کے نااہل ہو جاتا ہے تو بچوں کے بڑے ہونے سے ہی پہلے اُس کے یہ حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں مانتا، سوائے اس کے کہ جو قدرتی ہے اور جسے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

جہیز کی بُری اور قابلِ نفرت رسم کی مذمت کے لیے زوردار رائے عامہ تیار کرنی چاہیئے اور جو نوجوان اِس طرح کے مذموم طریقے سے جہیز لیتے ہیں۔ اُن کا سوسائیٹی سے بائیکاٹ کرنا چاہیئے۔ لڑکیوں کے والدین کو انگریزی ڈگریوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے اور اپنی بیٹیوں کے لیے ہونہار نوجوانوں کی تلاش میں اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتوں اور صوبوں کے محدود دائروں سے باہر جانے میں ہچکچانا نہیں چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ جہیز کی بُری رسم بہت ہی سنگدلانہ ہے اور اس طریقہ کار کو ختم ہونا چاہیئے۔ ماں باپ کو شادی روپے پیسے کی غرض سے کیا گیا کاروبار نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس رواج کا ذات پات سے بہت گہرا تعلق ہے جب کہ لڑکے لڑکی کا انتخاب کسی مخصوص ذات کے لڑکے لڑکی تک محدود رہے گا، اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے، یہ رواج جاری رہے گا۔ اگر اِس بُرائی کو ختم کرنا ہے تو لڑکوں اور لڑکیوں یا اُن کے والدین کو ذات پات کے بندھن توڑ دینے چاہئیں

ہم مذہب کے نام پر گئو رکھشا کی آواز اُٹھاتے ہیں لیکن گائے کی طرح معصوم بیوہ کی حفاظت سے ہم انکار کر دیتے ہیں۔ مذہب میں زبردستی اور طاقت کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ لیکن ہم مذہب کے نام پر اُن کمسن لڑکیوں پر جو شادی کی تقریب کا مفہوم بھی نہیں سمجھتیں، زبردستی بیوگی لاد دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کمسن لڑکیوں پر

زبردستی بیوگی لاونا ایک زبردست جرم ہے جو ہم ہندوؤں کو بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم شعوری طور پر بیدار ہوتے تو پندرہ برس سے بیشتر لڑکیوں کی شادی نہ کرتے۔ بیوگی کا تو سوال ہی نہیں۔ شاستروں میں اس قسم کی کسی بیوگی کا ذکر نہیں۔ جب کوئی عورت اپنے رفیقِ حیات کی محبت کے زیرِ اثر، جان بوجھ کر، اپنی مرضی سے بیوگی اپناتی ہے تب اس سے زندگی میں شان و عظمت پیدا ہوتی ہے، گھر پاک و مقدس ہوتا ہے اور خود مذہب کا عروج ہوتا ہے۔

سوال: آپ نے ہم لوگوں میں جاری بہت سی سماجی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ برائیاں ضرور ہیں لیکن اگر مرد یہ ضروری تبدیلیاں نہیں کرنا چاہتے تو ہم عورتیں اس بارے میں کیا کر سکتی ہیں۔؟

جواب: عورتوں کو اپنے آپ کو مردوں کے ماتحت یا اُن سے پست سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تمام زبانوں میں عورت کو مرد کی رفیقِ حیات کہا گیا ہے اس لحاظ سے مرد بھی عورت کا رفیقِ حیات ہے۔ دونوں الگ الگ ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک شئے کے دو حصّے ہیں۔ انگریزی زبان تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئی ہے اور اس میں عورت کو نصف بہتر کہا گیا ہے لہٰذا میں عورتوں کو تمام نامناسب اور بے ہودہ بندشوں کے خلاف بغاوت کرنے کا مشورہ دیتا ہوں یہ بندشیں فائدہ مند ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ رضاکارانہ طور پر عائد ہوں۔ بغاوت سے کسی طرح کے خطرے کا امکان نہیں ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مناسب اور مدلّل مخالفت ہو۔

بہنو! میں چاہتا ہوں کہ آپ ہری جنوں کے کام کے لئے جتنا بھی (روپیہ)

دے سکیں، دیں۔ آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ آپ ہری جنوں کی کس طرح خدمت کر سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے اپنے دل سے چھوت چھات نکال دیں اور پھر ہری جن لڑکے لڑکیوں کی اسی طرح خدمت کریں جس طرح آپ اپنے بچوں کی کرتی ہیں۔ آپ کو انہیں اپنے عزیز و اقارب، اپنے بہن بھائیوں اور اس بھارت ماتا کی اولاد کی حیثیت سے پیار کرنا چاہئیے۔ میں نے عورت کی ایثار اور قربانی کی دیوی کی حیثیت سے پرستش کی ہے۔ یہ عرضانہ جذبۂ خدمت کے معاملے میں جو قدرت نے آپ کو عطا کیا ہے، مرد آپ کی کبھی برابری نہیں کر سکتا۔

عورت کے دل میں رحم و کرم کا جذبہ موجزن ہوتا ہے اور وہ کسی کو دکھ اور مصیبت میں دیکھ کر پگھل جاتی ہے۔ اگر آپ ہریجنوں کی تکلیف سے غمگین و متاثر ہو جاتی ہیں اور چھوت چھات کو ترک کر دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اونچ نیچ کی تفریق کو بھلا دیتی ہے تو اس سے ہندو مذہب پاک و مقدس ہو جائے گا اور ہندو سماج تیزی سے روحانی ترقی کرے گا۔ انجام کار اس کا مطلب ہوگا تمام ہندوستان کی یعنی ۳۵ کروڑ لوگوں کی بھلائی۔

اپنی معروف زندگی میں مجھے بہت سے روح فرسا اور رقت انگیز مناظر دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اس سے طرح طرح کے اہم تجربات حاصل ہوئے ہیں لیکن یہ دیکھتے ہوئے مجھے جس سب سے بڑے رقت انگیز منظر کی یاد آرہی ہے۔ وہ ہے ہری جنوں کا مسئلہ۔ میں نے ابھی ابھی بڈاگرام میں تقریر ختم کی ہے، اس میں میں نے عورتوں سے اپنے گہنے دینے کی پرزور اپیل کی ہے۔ میں نے ابھی اپنی تقریر ختم ہی کی تھی اور پیش کردہ گہنوں کو فروخت کر رہا تھا کہ اسی وقت کومدی نامی ایک ۱۶ سالہ لڑکی آہستہ

آہستہ چل کر میرے پاس آئی اور اپنے ہاتھ کی چوڑی اُتار کر مجھ سے پوچھا کہ "کیا میں اُسے اپنے آٹوگراف دوں گا ؟"۔ جب میں آٹوگراف دینے کی تیاری کر ہی رہا تھا تو اُس نے دوسرے ہاتھ کی چوڑی اُتارنا شروع کی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ایک چوڑی تھی میں نے اس سے کہا کہ دوسری چوڑی اُتارنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ہی چوڑی کے بدلے آٹوگراف دیدوں گا۔"

اس کا جواب اُس نے اپنے گلے کا ہار اُتار کر دیا۔ اُسے اُتارنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ اُسے اپنے لمبے لمبے بالوں کے جوڑے سے نکالنا تھا۔ اُس مالابار کی لڑکی نے ہزاروں حیرت زدہ لوگوں کے سامنے اپنا ہار اُتارنے میں جھوٹی شرم کا سہارا نہیں لیا۔ میں نے پوچھا۔ کیا تم نے اپنے ماں باپ سے اس کی اجازت لے لی ہے ؟ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی اُس کے گہنے اُتارنے کا کام پورا نہیں ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ اس کے کانوں تک پہونچ گئے۔ اور اس نے حاضرین کی تالیوں کی گونج کے بیچ، جو اپنی خوشی پر قابو نہیں پا رہے تھے، اپنے ہیرے موتی کے بُندے اُتار دیئے۔ اُس سے میں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا اس قربانی کے بارے میں اُس نے اپنے والدین سے منظوری لے لی ہے اُس سے پہلے کہ اُس لڑکی سے مجھے سوال کا جواب ملتا، حاضرین میں سے کسی نے مجھے بتایا کہ لڑکی کا باپ اس جلسہ میں حاضر ہے اور جن زیورات کی میں نیلامی کر رہا تھا اُن کے لئے بولی بول کر وہ میری مدد کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ نیک کاموں کے لئے دان دینے میں اتنا ہی فیاض ہے جتنا کہ اُس کی بیٹی۔ میں نے کومدی کو جتا دیا کہ اُسے اُن زیورات کے عوض میں نئے گہنے نہیں بنوانے ہیں، اُس نے یہ شرط مان لی جب میں نے اُسے آٹوگراف دیئے تو پہلے لکھا کہ تمہاری زیورات سے یہ دستبرداری

اور قربانی، اُن زیورات سے زیادہ حقیقی اور سچا زیور ہے، جنہیں تم نے دان میں دے دیا ہے۔"

(ص) انگریزی قومی زبان نہیں بن سکتی

ہماری زبان ہمارا ہی عکس ہوتی ہے۔ اگر آپ مجھے یہ کہتے ہیں کہ ہماری زبانیں اتنی کمزور ہیں کہ اُن میں بہترین خیالات کی ترجمانی نہیں کی جاسکتی، تو میں یہ کہوں گا کہ ہمارا وجود جتنی جلدی ختم ہو جائے، بہتر ہی ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو خواب میں بھی یہ سوچتا ہو کہ کبھی انگریزی ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے؟ قوم پر یہ مصیبت کیوں ڈالی جائے؟ . . . مجھے پونا کے کچھ پروفیسروں کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے مجھے وثوق سے کہا ہے کہ چونکہ ہر ہندوستانی نوجوان انگریزی زبان کی وساطت سے تعلیم پاتا ہے، لہٰذا اپنی زندگی کے کم از کم چھ قیمتی برس بے کار ضائع کر دیتا ہے۔ اس تعداد کو ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والے طلبا کی تعداد سے ضرب دیجئے اور پھر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ قوم نے کتنے ہزار برس ضائع کر دیئے ہیں۔ ہمارے خلاف یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہمارے اندر پیش قدمی کی صلاحیت نہیں ہے۔
ہمارے خلاف یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہمارے اندر یہ صلاحیت کیسے ہو سکتی ہے جب کہ ہم اپنی زندگی کے بیش بہا سال ایک غیر ملکی زبان میں مہارت حاصل کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، اور ہم اس کوشش میں بھی ناکام ہو جاتے ہیں۔

دراصل ہم انگریزی میں کبھی بھی مہارت حاصل نہیں کر پاتے۔ کچھ تھوڑے سے افراد کے علاوہ ہم لوگوں کے لئے ایسا کرنا ممکن بھی نہیں ۔۔ ہم اپنے خیالات و افکار

کا انگریزی میں اتنی اچھی طرح سے اظہار نہیں کر سکتے۔ جتنی اچھی طرح سے ہم اپنی مادری زبان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے بچپن کے تمام برس کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ مگر جب ہم اپنی تعلیم، جیسا کہ ہم اُسے کہتے ہیں، ایک غیر ملکی زبان کے ذریعے شروع کرتے ہیں، تب ہم ٹھیک یہی کام کرتے ہیں۔ اس سے ہماری زندگی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے جس کے لئے بعد میں ہمیں بہت بڑی قیمت چکانا پڑے گی۔

میں نے لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ انگریزی تعلیم پائے ہوئے ہندوستانی ہی پیش پیش ہیں اور ملک کے لئے کچھ کرنے میں منہمک ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو بہت ہی بُرا ہوتا۔ جو تعلیم ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ صرف انگریزی تعلیم ہی ہے۔ یقیناً ہمیں اُس کا کچھ نہ کچھ فائدہ دکھانا چاہیے۔ لیکن فرض کیجئے، اگر ہم گزشتہ پچاس برس سے اپنی ملکی زبانوں کی وساطت سے تعلیم حاصل کر رہے ہوتے تو آج حالات کیا ہوتے؟ تب آج ہندوستان آزاد ہوتا۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اپنے ملک کی سرزمین پر غیر ملکیوں کی طرح نہ رہتے بلکہ اُن کی بولی عوام کے دلوں کو متاثر کرتی وہ غریب ترین آدمیوں کے درمیان کام کرتے اور جو کچھ انہوں نے گزشتہ پچاس برس میں حاصل کیا ہوتا، وہ قوم کی میراث ہوتا۔ آج ہماری بیویاں تک ہمارے عمدہ سے عمدہ خیالات وافکار میں شریک نہیں ہو پاتیں پروفیسر بوس اور پروفیسر رائے کی عالمانہ تحقیق پر نظر ڈالیے یہ شرم کی بات نہیں کہ عام لوگ انکی تحقیق سے ناواقف ہے

ہم سماج کی یہ بہترین خدمت انجام دے سکتے ہیں کہ ہم انگریزی زبان سیکھنے کو جو غیر معمولی اہمیت دینے لگے ہیں، اُس سے اپنے آپ کو اور سماج کو آزاد کر دیں۔ انگریزی ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم ہے۔ یہ ملک کی قومی زبان بنتی جا رہی ہے۔ ہمارے بہترین خیالات کا اظہار اسی زبان کے ذریعے ہوتا ہے۔ انگریزی تعلیم و تربیت کی

ضرورت کے اعتقاد نے ہمیں غلام بنا دیا ہے۔ اس نے ہمیں سچی قومی خدمت کرنے کے نااہل بنا دیا ہے۔ اگر ہم عادت سے مجبور نہ ہوتے تو یہ محسوس کر سکتے تھے کہ انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے ہماری ذہانت محدود ہو گئی ہے۔ ہم عوام سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے ہیں، ملک کے بہترین ذہن قیدی بن گئے ہیں اور جن نئے حالات و افکار سے ہم آگاہ ہوئے ہیں، اُن سے عام لوگ مستفید نہیں ہو سکے۔ گذشتہ ۶۰ سال سے ہم حقائق کو اپنانے کی بجائے نئی زبان اور اس کا تلفظ یاد کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ اپنی بنیاد ماں کی جانب سے دی گئی تعلیم و تربیت پر رکھنے کی بجائے ہم نے اُسے یکسر بُھلا دیا ہے۔ تاریخ میں اس طرح کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ یہ قومی المیہ ہے۔

ہم سماج کی سب سے بڑی اور اہم خدمت یہ کر سکتے ہیں کہ ہم ملکی زبانوں کو ازسرِ نو اپنائیں ہندی کو اس کے قومی زبان کے حقیقی مرتبے سے سرفراز کریں اور اپنے تمام صوبائی کاموں کو اپنی اپنی صوبائی زبانوں میں اور قومی کاموں کو ہندی میں کرنا شروع کریں۔ جب تک ہمارے اسکول اور کالج ہمیں دیسی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم نہیں دینے لگتے، تب تک ہمیں چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔

آج انگریزی کا مطالعہ اس کی تجارتی اور نام نہاد سیاسی اہمیت کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ ہمارے لڑکے سوچتے ہیں، اور ٹھیک ہی سوچتے ہیں کہ بغیر انگریزی کے وہ سرکاری نوکری حاصل نہیں کر سکتے۔ لڑکیوں کی اچھی جگہ شادی کرانے کے لیے انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ میں ایسی بہت سی خواتین کو جانتا ہوں جو انگریزی صرف اس لیے سیکھنا چاہتی ہیں کہ وہ انگریزوں سے انگریزی میں بات چیت کر سکیں۔ میں ایسے بہت سے خاوندوں کو بھی جانتا ہوں، جو اس بات سے دکھی ہیں کہ اُن کی بیویاں

اُن کے اور اُن کے دوستوں کے ساتھ انگریزی میں بات چیت نہیں کرسکیں۔ میں ایسے کنبوں سے بھی واقف ہوں جن میں انگریزی کو مادری زبان کی شکل دی جارہی ہے۔ میں یہ بات برداشت نہیں کرسکتا کہ دیسی زبانیں کچلی جائیں اور انہیں کمزور بنایا جائے۔ جیسا کہ اُنہیں بنایا جارہا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ والدین اپنے بچوں کو ، اور شوہر اپنی بیویوں کو اپنی زبان کی بجائے انگریزی میں خط لکھیں۔

اگرچہ مغربی تہذیب وتمدن کا جو قرض مجھ پر ہے، اُسے میں نے کھلے عام تسلیم کیا ہے۔ پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ قوم کی جو خدمات میں انجام دے سکا ہوں اُس کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس حد تک مجھ سے بن پڑا ہے، میں نے مشرقی تہذیب وتمدن کو اپنے اندر قائم رکھا۔ اگر میں انگریزی کے رنگ میں رنگا ہوتا ، قومی جذبات سے خالی ہوتا اور عوام کے طور طریقوں ، عادات وخیالات اور تمناؤں سے بے نیاز رہتا، اُن کی کم پرواکرتا اور اُن سے نفرت وحقارت کا اظہار کرتا تو عوام کے لئے میں بے کار ثابت ہوتا۔

جب کبھی میں نے طلباء کے اجتماع کو خطاب کیا ہے مجھے انگریزی میں تقریر کرنے کے مطالبے پر حیرت ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے یا معلوم ہونا چاہیئے کہ میں انگریزی زبان کا گرویدہ ہوں۔ لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر ہندوستان کے طلباء، جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ساتھ مِل کر کام کریں گے اور اُن کی خدمت کریں گے، اگر انگریزی کی بجائے ہندی کی جانب اُن کی زیادہ توجہ رہی تو وہ اس کام کے اہل نسبتاً زیادہ بنیں گے۔ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ آپ انگریزی نہ سیکھیں آپ ضرور سیکھئے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ، انگریزی کبھی بھی ہندوستان کے

کروڑوں افراد کی زبان نہیں بن سکتی ۔ وہ ہزاروں یا لاکھوں افراد تک ہی محدود رہے گی۔وہ کروڑوں لوگوں کی زبان نہیں بن سکے گی۔لہذا جب طلبا رجھ سے ہندی میں بولنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے ۔

آئیے اب ہم قومی زبان کے سوال پر غور کریں۔ اگر انگریزی کو ہماری قومی زبان بنانا ہے تو اسے ہمارے اسکولوں میں لازمی مضمون قرار دے دیا جانا چاہئے لیکن پہلے اس بات پر غور کریں کہ کیا انگریزی ہماری قومی زبان بن سکتی ہے ؟

ہمارے ملک کے کچھ عالم لوگوں کا، جو حب الوطن بھی ہیں خیال ہے کہ یہ سوال اُٹھانا ہی لاعلمی اور جہالت کی بات ہے۔اُن کا خیال ہے انگریزی نے تو پہلے ہی قومی زبان کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

معمولی غور و خوض کرنے پر مذکورہ بالا نظریہ درست معلوم ہوتا ہے ،ہمارے سماج کے تعلیم یافتہ طبقے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی کے نہ رہنے سے ہمارا کام کاج ٹھپ ہوجائیگا لیکن اس بات کی گہرائی میں جائیے تو پتہ چلے گا کہ انگریزی ہماری قومی زبان نہیں بن سکتی اور بننی بھی نہ چاہئے ۔

آئیے اس بات پر غور کریں کہ قومی زبان بننے کے لیے کیا کیا باتیں ضروری ہیں۔

۱۔ سرکاری افسروں کے لئے اس کا سیکھنا آسان ہونا چاہئے ۔

۲۔ وہ ہندوستان بھر میں مذہبی، اقتصادی اور سیاسی رابطے کا وسیلہ بننے کے اہل ہو۔

۳۔ ہندوستانیوں کی اکثریت یہ زبان بولتی ہو ۔

۴۔ سارے ملک کے عوام کے لئے یہ زبان سیکھنا آسان ہو

۵۔ اس زبان کا انتخاب کرتے وقت عارضی اور وقتی مفاد دھیان میں نہیں رکھنا چاہئے۔

انگریزی اُن میں سے کسی بھی ضرورت کو پورا نہیں کرتی . . . . پھر کون سی زبان ہے جو اِن پانچوں ضرورتوں کو پورا کرتی ہے ؟ ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ زبان ہندی ہے۔

مجھے اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی تمام ہندوستانیوں کے لیے سب سے کارآمد بین صوبائی زبان ہوگی۔ عام لوگ نہ تو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی اُردو ہی سمجھ سکتے ہیں اور نہ سنسکرت الفاظ سے بھرپور ہندی۔ برطانوی راج کے خاتمے پر انگریزی عدالتی زبان یا عام بول چال کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتی۔ میں انگریزی کا احترام کرتا ہوں لیکن یہ ہندوستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی۔

مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی زبان کے بارے میں جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے۔ کون سی زبان قومی زبان بنے ؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ دیوناگری حروف میں لکھی ہوئی ہندی قومی زبان ہوگی۔ میں اس سے کبھی متفق نہیں ہوسکتا۔ میں دو بار ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں۔ میں ہندی اور اُردو کا دشمن نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ عام آدمی کی زبان یعنی ہندوستان کی قومی زبان دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں لکھی جانے والی آسان ہندی اور اُردو کا امتزاج یعنی ہندوستانی ہوگی۔ مسلمانوں کو چھوڑیئے، میں ایسے متعدد ہندوؤں کو جانتا ہوں جو سنسکرت الفاظ والی ہندی نہیں سمجھ پاتے اور نہ وہ دیوناگری رسم الخط میں لکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا میں ہندوستانی زبان کا ہی حمایتی رہوں گا، چاہے میں اس حمایت میں اکیلا ہی رہ جاؤں۔

ہندوستان میں غیر ملکی زبان کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دینے کی وجہ سے قوم کو زبردست ذہنی اور اخلاقی نقصان پہونچا ہے۔ ہم اپنے عہد کے اتنے قریب ہیں کہ ہم اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اس سے کتنا زیادہ نقصان ہوا ہے اور ہم لوگوں کو جنہوں نے اس طرح کی تعلیم حاصل کی، اس کا شکار بھی ہونا ہے اور اس کا فیصلہ بھی کرنا ہے جو کہ ایک غیر ممکن سا کام ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو ذریعۂ تعلیم فوراً بدل دینا چاہئے۔ میں روز روز کے زبردست نقصان کے بجائے عارضی افراتفری کو ترجیح دوں گا۔

سنسکرت کے مطالعہ میں افسوسناک بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ میں اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو قدیم زبانوں کے مطالعہ میں اعتقاد رکھتی ہے میں یہ بات نہیں مانتا کہ اس طرح کے مطالعہ سے محنت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس سے جدید زبانوں کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ بات کسی اور زبان کی نسبت سنسکرت کے بارے میں زیادہ صحیح ہے اور ہر قوم پرست کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اس سے صوبائی زبانوں کا مطالعہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں ہمارے آباؤ اجداد نے غور و خوض کیا اور لکھا۔ اگر کوئی بھی ہندو لڑکا یا لڑکی اپنے مذہب کے خیالات و افکار سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ سنسکرت کی ابتدائی تعلیم سے بے بہرہ ہوں۔

(ط) طلباء سے

موجودہ حالات کو مدِ نظر رکھ کر ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ طلبا کیا خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ میری اور بہت سے لوگوں کی، جو اِس بات کے خواہاں ہیں،

کہ طلبا اپنے فرائض اچھی طرح نبھائیں۔ رائے یہ ہے کہ طلبا کو اپنے اندر جھانک کر دیکھنا چاہئے اور اپنے کردار کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔ اچھی تعلیم کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اُن کی ذاتی زندگی پاک وصاف ہو۔ ہزارہا طلباء سے میری ملاقات اور خط وکتابت ہوتی رہتی ہے جس میں وہ اپنے دلی جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہیں اور مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اُس سے مجھے پتہ چلتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے . . . . . تمام علم کا مقصد کردار بنانا ہونا چاہئے۔

عیسائی، ہندو اور دُنیا کے دیگر عظیم مذاہب کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ سب مذاہب میں ہم جو بھاری فرق دیکھتے ہیں۔ اُس کے باوصف اُن کے اندر ایک بُنیادی وحدت اور معصومیت ہے۔ سچائی اور معصومیت کو میں نے عدم تشدد اور کسی کی جان نہ لینے کے مترادف استعمال کیا ہے۔ اگر آپ کے بچے بے خوفی کے ساتھ سچائی اور معصومیت پر کاربند ہیں تو آپ نے نہایت ٹھوس بُنیاد پر تعمیر شروع کی ہے۔

سچائی ہر تالے کی کُنجی ہے۔ چاہے کیسے بھی حالات ہوں، جھوٹ مت بولئے، کسی بات کو چھپائیے نہیں۔ اپنے اُستادوں اور بزرگوں پر اعتماد کرکے اُنہیں ہر ایک بات سچ سچ بتا دیجئے۔ کسی سے بُغض مت رکھئے۔ کسی کی پیٹھ پیچھے بُرائی نہ کیجئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ خود اپنے تئیں سچے بنے رہئے جس سے آپ کسی دوسرے کے تئیں جھوٹے نہ بنیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے کام میں بھی سچ کا استعمال پاک زندگی کا واحد راز ہے۔

اس لئے میں سب لڑکے لڑکیوں سے کہتا ہوں کہ خدا میں بھروسہ نہ کھوئیے۔

اور اس طرح خود اپنے آپ میں اعتقاد مت کھوئیے اور یاد رکھئے کہ اگر آپ بُرے خیال کے تحت ایک بھی گناہ گارانہ خیال کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ آپ کے اندر اس اعتقاد کی کمی ہے۔ جھوٹ، تعصب، تنگ دلی، تشدد نفس پرستی، ان تمام باتوں کا اس اعتقاد سے میل نہیں۔ یاد رکھئے کہ اس دُنیا میں جتنے ہم خود اپنے بڑے دشمن ہیں، اُتنا اور کوئی نہیں۔ بھگوت گیتا کے لگ بھگ ہر اشلوک میں یہ بات کہی گئی ہے۔ اگر میں "سرمن آن دا ماؤنٹ" کی تعلیمات کا اختصار کر دوں تو مجھے یہی جواب ملے گا۔ قرآن کے مطالعے سے بھی میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ہم خود اپنا جتنا نقصان کر سکتے ہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر آپ بہادر لڑکے لڑکیاں ہیں، تو آپ ان سب بُرے خیالات کے خلاف جوانمردی اور بہادری سے نبرد آزما ہوں گے۔ اس دنیا میں کوئی بھی گنہگارانہ فعل، گنہگارانہ خیالات کی ترغیب کے بغیر کبھی نہیں ہوا۔ آپ کو اپنے دل میں پیدا ہونے والے ہر خیال اور جذبے پر پوری نگرانی رکھنی چاہئے۔

یہ جاننے کے لئے کہ مذہبی تعلیم دینے کا سب سے اچھا ڈھنگ کیا ہے، میں نے متعدد لڑکوں کے ساتھ تجربہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کتابی تعلیم سے کچھ مدد ضرور ملتی ہے لیکن صرف کتابی تعلیم بے کار ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اُستادوں کے ذریعے مذہبی تعلیم مذہب کے مطابق عمل کر کے دی جاتی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لڑکے خود اُستادوں کی زندگی سے جتنا سیکھتے ہیں، اُتنا وہ اُن کتابوں سے نہیں سیکھ پاتے جنہیں وہ اُن کے سامنے پڑھتے ہیں یا اُن الفاظ سے جو وہ اپنے منہ سے بولتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر ازحد خوشی ہوتی ہے کہ لڑکے لڑکیوں

میں چیزوں کو جاننے سمجھنے کی ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جس کا انہیں خود احساس نہیں ہوتا اور جس کے ذریعے وہ اپنے اُستادوں کے خیالات اور افکار سے واقف ہو جاتے ہیں۔ قابلِ افسوس ہے وہ اُستاد جو منہ سے کچھ اور کہتا اور دل میں کچھ اور رکھتا ہے۔

آپ کا سارا علم وفضل، شیکسپیئر اور ورڈزورتھ سے متعلق سارا مطالعہ بے کار ہو جائے گا اگر اُس کے ساتھ ساتھ آپ اپنا کردار نہیں بناتے اور اپنے خیالات اور افعال پر پورا قابو حاصل نہیں کر لیتے۔ جب آپ اپنے اوپر قابو پالیں گے، اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنا سیکھ جائیں گے تب آپ مایوسی اور نا اُمیدی کی باتیں نہیں کریں گے۔

ہمیں وراثت میں دیہی تہذیب ملی ہے۔ ہمارا ملک اتنا وسیع و عریض ہے، اُس کی آبادی اتنی زیادہ ہے اور اُس کے حالات اور آب و ہوا ایسے ہیں کہ میرے خیال میں یہاں دیہی تہذیب کا ہونا فطری ہے۔ اس کی خامیاں مجھ کو معلوم ہیں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں کہ اسے دُور نہ کیا جا سکے۔ اسے ختم کرنا اور اُس کی جگہ شہری تہذیب لاگو کرنا تب تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم کسی زبردست طریقے کے تحت آبادی کو تیس کروڑ سے گھٹا کر تیس لاکھ یا تین کروڑ تک کرنے کو تیار نہ ہو جائیں۔ لہٰذا میں یہ مان کر کہ ہمیں موجودہ دیہی تہذیب کو قائم رکھنا ہے، یہ تجویز کرتا ہوں کہ ہمیں اس کی واضح خامیوں کو دُور کرنے کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ یہ خامیاں تبھی دُور کی جا سکتی ہیں، جب ملک کے نوجوان دیہاتی زندگی بسر کرنے لگیں اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو انہیں اپنی زندگی کو

نئے ڈھنگ سے ڈھالنا چاہیئے اور اپنی چھٹیوں کا ہر دن اپنے ہائی اسکولوں اور کالجوں کے ارد گرد واقع گاؤوں میں گذارنا چاہیئے۔ جنہوں نے اپنی تعلیم ختم کرلی ہے یا جو تعلیم حاصل نہیں کر رہے انہیں گاؤوں میں بسنے کی بات سوچنا چاہیئے۔ وہ گاؤوں میں جائیں تو انہیں وہاں خدمت، تحقیق اور سچے علم کا لامحدود میدان ملے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ پروفیسر طلبا و طالبات کو چھٹیوں میں پڑھنے لکھنے کا کام نہ دیں بلکہ انہیں گاؤوں میں لے جاکر تعلیمی کام کرنے کی ہدایت کریں۔ چھٹیاں کتابیں حفظ کرنے کے لئے نہیں، بلکہ تفریح میں صرف کرنی چاہئیں

طلباء کو اگر پورا وقت نہیں تو کچھ وقت ہری جنوں کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہیئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر مجھے بہت سے مددگار مل جائیں جو اپنا خالی وقت مجھے دے سکیں تو بہت کام ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ تنخواہ دار لوگوں کے ذریعہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ بڑی سے بڑی رقم سے بھی یہ کام نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کا امتیازی حق ہونا چاہیئے۔ آپ کو اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم ملی ہے اس کی یہ کسوٹی ہے۔ آپ کی لیاقت کا اندازہ آپ کی خالص انگریزی میں کی گئی تقاریر سے نہیں کیا جائے گا۔ آپ کی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے گا کہ آپ غریبوں کی کتنی خدمت کرتے ہیں، نہ کہ اس سے کہ آپ چھ سو یا سات سو روپے کی سرکاری ملازمت کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کام کو اسی جذبے کے تحت کریں جس جذبے کے تحت میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے ایسا ایک بھی طالب علم نہیں ملا جس نے مجھ سے کہا ہو کہ وہ روزانہ ایک گھنٹہ وقف نہیں کر سکتا۔ اگر آپ ہر روز اپنا روزنامچہ لکھیں تو آپ سال میں ۳۶۵ دنوں میں سے بہت سے قیمتی

گھنٹے بیکار گنوا دیتے ہیں۔ اگر آپ اپنی تعلیم سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو آپ اس کام کی طرف توجہ دیں۔ یہ کام دشوار تو ہے، لیکن پُر لطف بھی ہے۔ یہ آپ کو مسرت عطا کرے گا۔ آپ کو اس سے ٹینس اور کرکٹ کے کھیل سے بھی زیادہ مسرت حاصل ہوگی میں آپ سے کہوں گا کہ آپ اپنی فرصت کے کچھ مقررہ گھنٹے ہریجنوں کی خدمت میں لگانے کا عہد کریں۔

سبھی سچے اسکاؤٹوں کو میرا آشیرواد حاصل ہو۔ دنیا کے مختلف حصّوں کے سفر کے دوران میرا ہزاروں اسکاؤٹوں سے واسطہ پڑا ہے۔ سچے اسکاؤٹ بہادر، ذہین، سمجھدار اور شائستہ ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے فرائض کا پورا احساس ہونا چاہیئے۔ وہ ملک کے اندر متعدد میلوں میں جہاں کروڑوں افراد اکٹھے ہوتے ہیں، نظم و نسق قائم رکھنے کا کام کرتے رہے ہیں۔ میں اُن سے بھی یہ توقع رکھوں گا کہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصّہ ہریجنوں کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ جو شخص بھی ہریجن بستیوں کو میری نگاہ سے دیکھے گا اُسے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ اُن سب افراد کے لیے خدمت کی کافی گنجائش ہے۔ جن میں خدمت کرنے کا جذبہ و صلاحیت موجود ہے، ان میں غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ہریجنوں کو اپنے جیسا سمجھنے کے جذبے کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اکثر طلبا کے ذریعے کی جانے والی ہڑتالوں کی مخالفت کی ہے۔ انہیں تبھی ہڑتال کرنی چاہئے جبکہ کوئی دوسرا چارہ نہ رہے۔ میں اس بات کو غلط سمجھتا ہوں کہ طلبا سیاسی مظاہروں اور سیاست میں حصّہ لیں۔ اس طرح کی سرگرمیوں سے اُن کی پڑھائی میں رخنہ پڑتا ہے۔ اور طلبا مستقبل کے شہری کی

حیثیت سے ٹھوس کام کرنے کے لائق نہیں رہ جاتے۔

میرا طلبا ء پر اور طلباء کا مجھ پر خاص حق ہے۔میں اپنے آپ کو اب بھی طالب علم سمجھتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان واپس آنے کے وقت سے ہی میرا اُن سے قریبی رابطہ رہا ہے اور اُن میں سے بہت سے طلباء نے ستیہ گرہ میں کام کیا ہے۔اس لئے اگر طلباء کا سارا سماج بھی کسی عارضی وجہ کی بنا پر میری مخالفت کرے تب بھی میں اس ڈر سے صلاح دینا بند نہیں کروں گا کہ میرا مشورہ نہیں مانا جائے گا۔

سیاست میں پڑنا طلباء کے لئے سود مند نہیں۔ وہ سب پارٹیوں کی بات سُنیں جس طرح وہ ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔لیکن اُن کا کام ہے کہ ان سب باتوں میں سے سچائی اخذ کریں اور باقی باتوں کو ٹھکرا دیں۔یہی ایک واحد نظریہ ہے جو انہیں اپنانا چاہئے۔ طلباء کے سماج کو سیاست سے بے نیاز رہنا چاہئے۔جب طلبا اس طرح کی سیاست میں پڑ جاتے ہیں؛ وہ طالب علم نہیں رہتے۔اس لئے وہ خطرے کے وقت ملک کی خدمت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ . . . لہٰذا میرے مشورے کو ٹھکرانے سے پہلے اُنہیں پچاس بار سوچ سمجھ لینا چاہئے۔

سوال : جب ہندوستان آزادی حاصل کرے گا تب تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا نصب العین ہوگا ؟

جواب : کردار بنانا۔میں حوصلہ طاقت ، قابلیت سے عظیم کام انجام دیتے ہوئے اپنے آپ کو فراموش کر دینے کی صلاحیت کی نشو و نما کرنے کی کوشش کروں گا۔یہ پڑھنے لکھنے سے زیادہ ضروری ہے۔اسکولی تعلیم اس عظیم مقصد کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے۔

۷۔ فرد کی بھلائی کے لئے

جو شخص اپنے آپ کو کھو دیتا ہے وہ خُدا کو پا لیتا ہے۔ اگر ہم اس بات کی اہمیت کو سمجھ لیں تو ہمیں سچ مچ اور جاننے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تب آدمی سب کاموں کو اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے کرے گا۔

اس وسیع و عریض دنیا میں انسان کی، جسے ایک جانور سمجھا جاتا ہے، کوئی اہمیت نہیں ہے۔ طبعی لحاظ سے وہ ایک حقیر کیڑا ہے۔ لیکن خدا نے اُسے دماغ اور اچھے بُرے میں تمیز کرنے کی قوت عطا کی ہے۔ اگر ہم اس قوت کا استعمال خدا کو جاننے میں صرف کرتے ہیں تو ہم بھلائی کی ایک قوت بن جاتے ہیں اگر ہم اس قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں، تو ہم بُرائی کے ہاتھ آلہ کار بن جاتے ہیں اور اس وبا اور پلیگ جیسی مصیبت بن کر اس دھرتی کو جنگ اور قتل و خون، مصائب و تکالیف سے بھر دیتے ہیں۔

میری حقیر رائے میں اگر ہم کوئی مستقل اور حقیقی شے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے لئے بے خوفی شرطِ اولین ہے۔ یہ خوبی بغیر مذہبی شعور کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہم ایشور سے ڈریں گے تو انسان سے بے خوف ہو جائیں گے۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ہمارے اندر خدا موجود ہے اور ہم جو کچھ سوچتے یا کرتے ہیں، اُسے وہ دیکھتا اور ہماری حفاظت کرتا ہے اور ہمیں سچے راستے پر لے جاتا ہے تو یہ واضح

ہے کہ اس سرزمین پر ہم خُدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈریں گے۔

روحانیت کی پہلی ضرورت بے خوفی ہے۔ ڈرپوک آدمی کبھی بااخلاق نہیں ہوتا۔

اکثر ہم روحانی جانکاری کو رُوحانی تکمیل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ روحانیت کا مطلب مذہبی کتابوں کا علم اور فلسفیانہ بحث مباحثہ نہیں۔ اس کا تعلق دل کی پاکیزگی سے ہے جس کی قوّت بے حساب ہوتی ہے۔

نیکی کی زندگی گذارنا ہمارا فرض ہے۔اس لئے نہیں کہ اس سے ہمارا بھلا ہوگا بلکہ اس کے لیے کہ یہ قدرت کا ابدی اور اٹل اصُول ہے۔سچے اور نیک کام کا مطلب ہے صرف نیکی کرنے کے مقصد سے برابر نیکی کرتے رہنا۔ . . . نیک کام کرنے کی قوت ہمیں باہر سے نہیں ملتی۔ وہ ہمیشہ ہمارے اندر موجود رہتی ہے۔اور ہمیں مناسب میلوں سے اس کی نشو ونما کرنی ہوتی ہے۔سب سے بڑا اخلاقی قانون یہ ہے کہ ہم بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے، متواتر کام کرتے رہیں۔ یہ کہیں اچھا ہے کہ ہماری زندگیاں خود نمونہ اور مثال ہوں بجائے اس کے کہ ہم اپنے منہ سے اپنی ہی تعریف کریں . . . ۔عقیدے کی تبلیغ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے مطابق ہی زندگی بسر کرنی چاہئے اور اس طرح اس کی خود تبلیغ ہو جاتی ہے۔

اکثر بُرائی سے بھلائی نکلتی ہے۔لیکن یہ خدا کے ہاتھ میں ہے، نہ کہ انسان کے ہاتھ میں۔انسان جانتا ہے کہ بُرائی سے صرف برائی پیدا ہوتی ہے۔جس طرح اچھائی سے صرف اچھائی پیدا ہوتی ہے۔

اگر آپ صرف بھلائی کے بدلے بھلائی کرتے ہیں تو یہ صرف سودا بازی

ہے اور اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ برائی کے بدلے میں بھلائی کرتے ہیں تو یہ ایک کارِ خیر ہے۔ اس کے سامنے برائی ختم ہو جاتی ہے اور برف کے گولے کی مانند نیکی کی قوت اور رفتار اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

کوئی بھی قربانی تب تک حقیقی قربانی نہیں بنتی جب تک کہ وہ خوشی سے نہ کی جائے۔ قربانی اور اترے ہوئے چہرے کا کبھی میل نہیں ہوتا۔ قربانی کا مطلب ہے پاکیزہ بنانا۔ جس شخص کو اپنی قربانی کے لئے ہمدردی کی ضرورت ہو وہ ایک ادنیٰ آدمی ہوتا ہے۔ ایسی قربانی زیادہ دیر نہیں چلتی۔

کسی کام کو کرنے میں جو جدوجہد، کشمکش اور مصیبت اٹھانی پڑتی ہے، خوشی اس میں ہے نہ کہ کامیابی میں۔ کیوں کہ کامیابی تو اس طرح کی کوشش کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔

انسان اپنے خیالات کی ہی پیداوار ہے۔ جیسے اس کے خیالات ہوتے ہیں، ویسا ہی وہ بن جاتا ہے۔

خوشی آخرکار ایک ذہنی حالت ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے، میں ایک زمانے سے سخت زندگی گذارنے کا عادی ہونے کی وجہ سے اپنی خوشی کو اپنے اطراف کے حالات سے غیر متاثر نہیں رکھ سکتا۔

انسان جس حد تک دوسروں کی بھلائی کے لئے کام کرتا ہے، اسی حد تک وہ عظیم بن جاتا ہے۔

جو کام بغیر کسی کے کہے خود بخود ہنسی خوشی کیا جائے وہ کبھی تکلیف دہ نہیں ہوتا۔

اگر کوئی آدمی اپنے کام میں محو ہو جائے تو کام اُسے بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اس سے پریشان نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اُس کام میں دلچسپی نہیں لیتا تو تھوڑا سا بھی کام اُس کے لئے بہت زیادہ ہو جائے گا۔ جیل میں ایک انسان کے لئے ایک دن ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ ایک نفس پرست کے لئے ایک سال ایک دن کی مثل ہوتا ہے۔ پہلے جب میں یورپین موسیقی سنتا تھا تو بہت جلد اوب جاتا تھا لیکن اب میں کچھ کچھ سمجھتا ہوں اور اُسے پسند کرتا ہوں۔

پیدائشی عجز و انکسار کبھی چھپا نہیں رہ سکتا اور پھر بھی جس میں یہ ہوتا ہے وہ اُس کے وجود سے بے خبر ہوتا ہے۔

سوال: اپنے آپ کو صفر بنا دینے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس کا مطلب ہے اچھی چیزوں کے حصول میں سب سے پیچھے رہنا، ہر ایک کی خدمت کرنا، احسان کی توقع نہ کرنا اور تکلیف برداشت کرنے میں سب سے پیش پیش رہنا۔ جو شخص اس طرح اپنے آپ کو صفر بنا دے گا وہ ہمیشہ اپنے کام میں محو رہے گا۔

انسان اور اس کا کام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جہاں ایک اچھے کام کی تعریف و توصیف اور بُرے کام کی مذمت کرنی چاہئے، وہاں کام کرنے والے شخص کو اگر اچھا کام کر رہا ہے تو عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے اور اگر بُرا کام کر رہا ہے تو اس پر ترس کھانا چاہئے۔

جب انسان زندگی کے ایک شعبے میں غلط کام کر رہا ہو تو وہ زندگی کے دوسرے شعبے میں صحیح کام نہیں کر سکتا۔ زندگی ایک غیر منقسم اکائی ہے۔

جب تک کوئی شخص یہ محسوس کرتا رہے گا کہ وہ دوسرے سے چھوٹا یا بڑا ہے تب تک مساوات نہیں آسکتی کیونکہ ایک ہی مرتبے کے افراد میں بڑائی دکھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی
ہمارے مخالف کسی شے کے بارے میں جس ڈھنگ سے سوچتے ہیں۔ جب ہم بھی اُسی ڈھنگ سے سوچنے لگیں گے تب ہم اُن سے پورا پورا انصاف کر سکیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے لئے غیر جانبدار ذہن کی ضرورت ہے۔ جس کا حصول بہت مشکل ہے۔ تاہم ایک ستیہ گرہی کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو اپنے مخالفین کی حالت میں رکھ کر ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں تو دُنیا کے تین چوتھائی مسائب اور غلط فہمیاں ختم ہو جائیں۔ تب ہم اپنے مخالفین کے ساتھ جلد ہی متفق ہو جائیں گے یا اُن کے بارے میں ہمدردی سے غور کریں گے۔

یہ کہنا بُری عادت ہے کہ دوسرے آدمی کے خیالات بُرے ہیں۔ اور صرف ہمارے خیالات اچھے ہیں اور جو لوگ ہم سے مختلف خیالات رکھتے ہیں وہ دیش کے دشمن ہیں۔ جس طرح ہم مدعی ہیں کہ ہماری ایمانداری اور جذبۂ حب الوطنی قابلِ احترام ہے، اسی طرح ہمیں اپنے مخالفین کی بھی انہی خوبیوں کی وجہ سے عزت کرنی چاہئے۔

یہ سچ ہے کہ اکثر لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے اور بہت سے افراد میری توقع کے مطابق نہیں نکلے۔ لیکن میں اُن کے ساتھ اپنے تعلقات کے لئے کبھی پچھتاتا نہیں۔ کیوں کہ جس طرح میں تعاون کرنا جانتا ہوں، اسی طرح عدم تعاون کرنا بھی جانتا ہوں۔ دُنیا میں زندگی گذارنے کا سب سے باعزت اور باعمل طریقہ یہ ہے کہ لوگوں پر اعتماد کیا جائے۔ جب تک کہ ایسا نہ کرنے کی آپ کے پاس کوئی ٹھوس

وجہ نہ ہو۔

ہمارا اصول ہمیشہ لوگوں کو شرافت کے ساتھ سمجھا بجھا کر اور اُن کے دل و دماغ کو متاثر کر کے اُن کا دل بدلنا ہونا چاہیے۔ اس لئے جو لوگ ہم سے مختلف نظریات و خیالات رکھتے ہیں، اُن کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور صبر و تحمل کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے مخالفین کو دیش کا دشمن سمجھنے سے مستقل مزاجی سے انکار کر دینا چاہئے۔

غلطی ایک بُری شے ہے لہٰذا اُس کے لئے ہمیں شرمندہ ہونا چاہیے۔ غلطی ماننا اور اس کے لئے معافی مانگنا اچھی بات ہے۔ اسی لئے ہمیں ایسا کرتے ہوئے شرمانا نہیں چاہیے۔ کسی غلطی کے لئے معافی مانگنے کے معنی ہوتے ہیں پھر سے غلطی نہ کرنے کا تہیہ کیا۔ اس طرح کا تہیہ کوئی ایسی حرکت ہے جس کے لئے شرمندہ ہوا جائے؟

غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے۔ ہم اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے انہیں اپنے آگے بڑھنے کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی غلطی چھپانے کی کوشش کرتا ہے وہ مکر و فریب سے کام لیتا ہے اور وہ لحظہ بہ لحظہ گرتا چلا جاتا ہے۔

غلطی کا اعتراف کرنا اور پھر اُسے نہ دہرانے کا تہیہ کرنا سب سے اچھا اور پاکیزہ کفارہ ہے۔ غلطی کا اعتراف کرنا ایک جھاڑو کی مانند ہے جو گرد و غبار جھاڑ کر سطح کو پہلے سے زیادہ صاف و شفاف بنا دیتا ہے۔ دُنیا کے سامنے جھوٹا دکھائی پڑنا اپنے تئیں جھوٹا ہونے کی نسبت لاکھوں کروڑوں گنا زیادہ اچھا ہے، غلطیوں کا اعتراف نہ کرنے سے بڑھ کر اور کوئی بات شرمناک نہیں۔

جو شخص انسانیت کی خدمت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن لوگوں سے ناراض نہ ہو جن کی وہ خدمت کر رہا ہے۔

اگر آپ کو لڑائی ہی کرنی ہے تو سچائی کے لئے کیجئے۔ خدا آپ کی مدد کرے گا۔ میں پھر سے کہتا ہوں کہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے روحانی پاکیزگی اور مصیبتیں برداشت کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔

لیکن خود اپنی مرضی سے کئے گئے ضبطِ نفس سے انسان میں سچی آنی چاہئے مگر جب آدمی اُس سے گھبرا جاتا ہے یا دُکھی ہو جاتا ہے تب وہ مشین جیسا بن جاتا ہے۔

انسان ہمیشہ نامکمل ہی رہے گا اور اُسے ہمیشہ مکمل بننے کی کوشش کرتے رہنا ہوگا۔

تمام سچائیاں صرف سچے خیالات ہی نہیں بلکہ سچے چہرے سچی تصویریں یا گیت بھی بہت حسین ہوتے ہیں۔ عموماً لوگ سچائی میں حسن نہیں دیکھ پاتے عام آدمی اس سے دُور بھاگتا ہے اور اس میں پنہاں خوبصورتی کو نہیں دیکھ پاتا۔ جب لوگ سچائی میں حُسن کا دیدار کرنے لگیں گے تب حقیقی فن کی تخلیق ہوگی۔ حقیقی حُسن کی تخلیق تبھی ممکن ہوتی ہے جب صحیح طریقے سے کام کیا جاتا ہے۔ اگر زندگی میں ایسے لمحے بہت کم آتے ہیں تو وہ آرٹ میں بھی بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔

میں سچائی کے بارے میں بار بار اس لئے کہتا ہوں کہ یہ دماغ کو متاثر کرتی ہوئی دِل تک پہنچ جائے۔ جب تک یہ دماغ میں رہتی ہے تب تک یہ بوجھ

نکا رہتی ہے۔ کوئی بھی سچائی جو دماغ میں آئے اُسے فوراً دل تک پہنچا دینا چاہئے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا اس کی شکل وصورت بگڑ جائے گی اور وہ دماغ میں ایک زہریلے مادے کی طرح پڑی رہے گی۔ جب کوئی چیز دماغ کو زہر آلود کردیتی ہے تو وہ پورے جسم کو زہر آلود کردیتی ہے۔ لہٰذا دماغ کو صرف ذریعۂ ترسیل کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کچھ دماغ تک پہنچتا ہے یا تو وہ فوراً کارروائی کے لئے دل تک منتقل کر دیا جاتا ہے یا اُسے ناقابلِ انتقال سمجھ کر فوراً ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ دماغ کے ذریعے یہ کام ٹھیک طرح سے سرانجام نہ دینا ہی لگ بھگ اُن سبھی امراض کی جڑ ہے جو جسم کو ہو جاتے ہیں اور یہی دماغی تھکاوٹ کی وجہ ہے۔

ہم میں سے بہت سے افراد ایسے ہیں جو پڑھتے پڑھتے سوچنے سمجھنے کی قوت تک کھو بیٹھتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ پڑھنا چھوڑ دیں اور جو کچھ انھوں نے پہلے پڑھا ہے اس پر غور وخوض کریں۔

نفسانی خواہشات پر فتح حاصل کرنا کسی بھی مرد یا عورت کا سب سے بڑا فرض ہے۔ خواہشِ نفسانی پر قابو پائے بغیر آدمی اپنے آپ پر حکمرانی کرنے کی اُمید نہیں کرسکتا اور اپنے آپ پر حکمرانی کئے بغیر سوراج یا رام راج حاصل نہیں ہوسکتا۔ اپنے آپ پر حکومت کئے بنا باقی سب پر حکومت کرنا اُسی طرح دھوکا اور فریب ثابت ہوگا ـــــ جس طرح رنگا ہوا مٹی کا آم جو باہر سے دیکھنے میں تو بہت خوبصورت ہوتا ہے مگر اندر سے خالی بے مصرف ہوتا ہے۔ کوئی بھی کارکن جس نے شہوانی خواہشات پر فتح نہیں پائی، وہ ہریجنوں کی خدمت، فرقہ وارانہ اتحاد، کھادی، گاؤوں کی ازسرِ نو تعمیر یا گائے کے تحفظ

ایسے کاموں میں کوئی قابلِ قدر خدمت انجام دینے کی توقع نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے کارہائے نمایاں صرف دماغی قوت سے ہی انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ ان کے لئے روحانی قوت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی قوت صرف خدا کی مہربانی سے حاصل ہوتی ہے اور خدا کی مہربانی کبھی بھی ایسے شخص پر نہیں ہوتی جو نفسانی خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔

اب برہمچریہ کے معنی یا تعریف سنئے۔ اس کے بنیادی معنی یوں بتائے جا سکتے ہیں۔ ایسا طور طریقہ جو انسان کو خدا کے قریب لے جائے۔

اس طرح کے طور طریقے کا مطلب ہے تمام نفسانی خواہشات پر قابو پا لینا یہی اس لفظ کے حقیقی اور صحیح معنی ہیں۔

عموماً لوگ اس کے معنی شہوانی خواہشات پر جسمانی پابندی سمجھتے ہیں۔ اس محدود معنی نے برہمچریہ کے معنی کی قدر و قیمت بہت کم کر دی اور اس پر عمل کرنا ناممکن بنا دیا ہے۔ سبھی نفسانی خواہشات پر مناسب کنٹرول کے بغیر شہوانی خواہشات پر کنٹرول ناممکن ہے۔ وہ سب ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ نچلی سطح پر دماغ بھی حواس کے تحت ہوتا ہے۔ بغیر اپنے دل و دماغ پر کنٹرول کے یہ جسمانی کنٹرول۔۔۔ چاہے وہ عارضی طور پر ہو کبھی کام کا نہیں ہوتا۔

برہمچریہ پر دل، عمل اور بات چیت تینوں طرح سے کاربند رہنا چاہیئے اگر دل کو ادھر اُدھر بھٹکنے دیا جائے اور جسم کو کچلا جائے تو وہ ضرر رساں ہوتا ہے۔ جہاں دل اِدھر اُدھر بھٹکتا ہے تو دیر سویر سے جسم بھی اسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ مکمل تیاگ، مکمل برہمچریہ ایک مثالی شے ہے۔ اگر آپ اس بارے میں

غور و خوض نہیں کر سکتے تو آپ ضرور شادی کر لیجئے مگر اس کے بعد بھی نفس کشی کیجئے
جنسی خواہش ایک اچھی اور اعلیٰ شے ہے۔ اس میں شرمانے کی کوئی بات
نہیں لیکن یہ صرف اولاد پیدا کرنے کے لئے ہے کسی دیگر مقصد کے لئے جنسی خواہش
خدا اور انسانیت کے خلاف ایک گناہ ہے۔
اگر ہم یہ ماننے لگیں کہ مجامعت سے لطف اندوزی ضروری ہے۔ اور اس
میں کوئی نقصان یا گناہ نہیں تو ہم اس پر کوئی روک نہیں لگائیں گے۔ اور اُسے
روکنے سے قاصر ہو جائیں گے اور اگر ہم یہ ماننے لگیں گے کہ اس طرح کی لطف اندوزی
نقصان دہ، غیر ضروری اور گناہ ہے اور اُسے قابو کیا جا سکتا ہے، تب ہم دیکھیں
گے کہ نفس کشی مکمل طور پر ممکن ہے۔
مجھے بغیر برہمچریہ کے زندگی بے معنی اور جانوروں ایسی معلوم ہوتی ہے۔
جانوروں کو فطری طور پر نفس کشی کا علم نہیں ہوتا۔ انسان اسی لئے انسان ہے
کیونکہ وہ اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے۔ وہ اسی حد تک انسان ہے جس حد تک
وہ نفس کشی کرتا ہے۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ ہماری مذہبی کتابوں میں برہمچریہ کی ضرورت
سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اب مجھے یہ قطعی طور پر مناسب اور تجربات پر
مبنی معلوم ہوتا ہے اور یہ بات روز بروز مجھ پر اچھی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے۔
میرا خیال ہے کہ روحانی تکمیل کے لئے، دل، عمل اور بات چیت سے مکمل
طور سے پارسا ہونا ضروری ہے۔ اور جس قوم میں ایسے افراد کی کمی ہوتی ہے وہ
قوم اس کمی کی وجہ سے زیادہ غریب ہو جاتی ہے۔
شادی شدہ افراد کو شادی کے حقیقی مقصد کو سمجھنا چاہئے اور بنی نوع

انسان کے وجود کو بنائے رکھنے کے لیے، اولاد پیدا کرنے کے سوا کسی اور مقصد سے برہمچریہ کے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہئے۔

ایسا کرنا مشکل ہے لیکن اس دُنیا میں ہم اس لیے جنم لیتے ہیں کہ ہم مشکلات اور ہوس کے خلاف نبرد آزما ہوں اور اس پر فتح حاصل کریں اور جس شخص میں اس خواہش کا فقدان ہوتا ہے وہ حقیقی صحت کی بے انتہا مسرت سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ برہمچریہ کی محدود تعریف و تشریح سے کافی نقصان پہنچا ہے۔ اگر ہم سب طرف سے ایک ساتھ نفس کشی کرنے کی کوشش کریں گے تو ہماری کوشش سائنٹفک ہوگی اور اُس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان رہے گا۔ ذائقہ ہی غالباً سب سے بڑا گناہ گار ہے۔

ذائقے پر کنٹرول کا برہمچریہ قائم رکھنے سے گہرا تعلق ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اگر کوئی ذائقے پر قابو پا لیتا ہے تو اس کے لیے برہمچریہ پر قائم رہنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی ایماندار شخص اپنے بیتے دِنوں کی غلطیوں کو فراموش کر کے پاکیزہ زندگی گذارنے لگتا ہے تو اس کا پھل فوراً ملتا ہے۔ جو لوگ تھوڑے وقت کے لئے بھی برہمچریہ پر کاربند رہتے ہیں، انھوں نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح اُن کے جسم اور دِل کی قوت برابر بڑھتی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس خزانے کو کھونا نہ چاہیں گے۔

انسان اس لئے دنیا میں آیا ہے کہ وہ اُس کے تئیں اپنا قرض ادا کر سکے اور

خدا کی خدمت کے لئے اُس کی مخلوق کی خدمت کرے۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر انسان اپنے جسم کے محافظ کے طور پر کام کرتا ہے اور اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے جسم کی دیکھ بھال کرے کہ اُس کے ذریعے بہترین ڈھنگ سے یہ خدمت انجام دے سکے۔

اگرچہ زندگی اور موت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں اور اگرچہ ہمیں اتنی ہی خوشی سے مرنا چاہیے جتنی خوشی سے ہم زندہ رہتے ہیں۔ پھر بھی جب تک زندگی ہے، تب تک جسم کو اس کی مناسب اہمیت دینا ضروری ہے۔ یہ کام ہمیں خدا نے سونپا ہے اور ہمیں جسم کی پوری طرح مناسب دیکھ بھال کرنی چاہیئے

آپ لوگوں کو جسم کے بارے میں، جو اپنے اندر موجود رُوح کے ارتقا میں ایک اہم حصہ لیتا ہے، پوری جانکاری حاصل کرنی چاہیئے! اس پر بھی ہم اس کے تئیں جتنی افسوس ناک بے التفاتی اور تغافل برتتے ہیں، اتنی اور کسی شے کے تئیں نہیں برتتے۔ اُسے خانۂ خدا کی شکل میں استعمال کرنے کی بجائے ہم اسے عیش و عشرت کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور عیش و عشرت میں اضافہ کرنے اور فانی جسم کا غلط استعمال کرنے کی اپنی کوشش میں ہم ڈاکٹروں کے پاس مدد کے لیے دوڑنے میں بھی نہیں شرماتے۔

مکمل صحت صرف خدا کے بنائے ہوئے اصولوں پر کاربند زندگی گذارنے اور شیطانی قوتوں کی مخالفت کر کے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ حقیقی مسرت بغیر حقیقی صحت کے ناممکن ہے اور حقیقی صحت اپنے ذائقے پر قابو پائے بغیر ممکن نہیں۔ جب ذائقے پر کنٹرول کر لیا جاتا ہے، تب سب حواس اپنے آپ قابو میں آجاتے ہیں۔

اور جس نے اپنے حواس پر فتح حاصل کرلی۔ اس نے سچ مچ ساری دنیا کو فتح کرلیا اور وہ خدا کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی جسم میں خدا کا قیام ہے۔ ہمارا جسم ہمیں اس شرط پر عطا کیا گیا ہے کہ ہم اس کے ذریعے خدا کی پوری لگن سے خدمت کریں۔ اسے اندر اور باہر دونوں طرف سے صاف اور پاکیزہ رکھنا ہمارا فرض ہے، جس سے کہ ہم وقت آنے پر اسے اپنے مالک کو ویسی ہی پاکیزہ حالت میں لوٹا سکیں جیسی پاکیزہ حالت میں ہمیں وہ ملا تھا۔ اگر ہم خدا کی شرائط اس کی مرضی کے مطابق پوری کریں تو خدا ہمیں ضرور اس کا صلہ دے گا اور ہمیں حیاتِ ابدی کا حقدار بنا دے گا۔

دراصل جسم ایک اچھا خادم ہوسکتا ہے، لیکن جب یہ آقا بن جاتا ہے تو اس کی بدی کی قوتیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔

تہذیب کے اصلی معنی ضروریات میں اضافہ نہیں بلکہ رضاکارانہ طور پر اپنی مرضی سے اپنی ضروریات پر بندش لگانا ہے۔ اس سے ہی حقیقی مسرت اور آسودہ خاطری نصیب ہوتی ہے اور خدمت کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

ایک مقررہ حد تک جسمانی ہم آہنگی اور آرام ضروری ہیں۔ لیکن ایک خاص حد سے زیادہ ہونے کی صورت میں مدد کے بجائے رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی ضروریات کو لامحدود کرتے جانا اور انہیں پورا کرنے کی دھن میں لگے رہنا ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ لہٰذا فرد کو اپنی ضروریات کی تکمیل ایک مقررہ حد تک کرنی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ جسمانی اور ذہنی عیش و عشرت کی شکل اختیار کرلیں گی۔ انسان کو اپنے جسمانی اور

تمدنی حالات کو اس طرح منظم کرنا چاہیئے کہ اُن کی وجہ سے اس کی انسانی خدمت جس میں اُس کی ساری قوت خرچ ہونی چاہیے، رخنہ نہ پڑے۔

جیسے ہی انسان اپنی روزمرّہ کی ضروریات بڑھانے لگتا ہے، ویسے ہی وہ سادہ زندگی اور اعلےٰ کردار کے نصب العین سے نیچے گر جاتا ہے۔ تاریخ اِس بات کو اچھی طرح ثابت کرتی ہے۔ انسان کی خوشی دراصل صبر و اطمینان میں ہے۔ جو شخص مطمئن نہیں ہوتا، اس کے پاس چاہے کتنی ہی زیادہ دولت ہو وہ اپنی خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے اور اپنی خواہشات کا غلام ہونے سے بڑھ کر اور کوئی غلامی نہیں ہے۔ سبھی پیروں فقیروں نے واضح طور پر یہ بات کہی ہے اور انسان خود اپنا سب سے بڑا دشمن اور سب سے بڑا دوست ہو سکتا ہے۔ آزادی یا غلامی خود اس کے ہاتھوں میں ہے اور جو بات فرد کے لیۓ صحیح ہے وہ سماج کے لیۓ بھی صحیح ہے۔

میں نے تجربہ سے یہ سیکھا ہے کہ سچائی کے مداح کے لیۓ خاموشی اس کے رُوحانی انضباط کا ایک حصّہ ہے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر سچائی کو مبالغہ آمیزی سے بیان کرنا اُسے چھپانے یا توڑتے مروڑنے کا رجحان انسان کی فطری کمزوری ہے اور اِس پر فتح حاصل کرنے کے لیۓ خاموشی انتہائی ضروری ہے۔

کم گو کوئی بات بغیر سوچے سمجھے نہیں کہے گا۔ وہ ہر لفظ کو ناپ تول کر اپنے منہ سے نکالے گا۔

میرے لیۓ یہ (خاموشی) جسمانی اور روحانی دونوں طرح سے ضروری ہو گئی ہے۔ ابتدا میں میں نے اُسے اس لیۓ شروع کیا تھا جس سے کام کا بوجھ کم محسوس ہو، پھر مجھے لکھنے کے لیۓ وقت کی ضرورت تھی۔ کچھ عرصہ تک اس کی مشق کرنے کے

بعد میں اس کی رُوحانی قدر و قیمت بھی جان گیا۔ تبھی اچانک میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہی وقت ایسا ہوتا ہے جبکہ میں اپنے کو خدا کے انتہائی قریب محسوس کرتا ہوں جیسے میں فطری طور پر خاموشی اختیار کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا۔

دراصل وہی شخص خاموش رہتا ہے جو بولنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی ایک بھی بیکار لفظ نہیں بولتا۔

۸۔ ہم سب ایک انسانی کنبے کے فرد ہیں

میں ہندوستان کا ایک حقیر خادم ہوں اور ہندوستان کی خدمت کرنے کی کوشش میں پوری انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ لگ بھگ پچاس برس کی عوامی زندگی گزارنے کی بعد آج میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی قوم کی خدمت دُنیا کی خدمت سے مختلف نہیں ہے۔ یہ ایک اچھا نظریہ ہے۔ اسے مان لینے سے ہی دُنیا کی حالت سُدھر سکتی ہے اور ہماری اس زمین پر رہنے والی قوموں کا آپسی بغض وعناد ختم ہو سکتا ہے۔

خُدا نے میری قسمت کو ہندوستانی عوام کے ساتھ وابستہ کیا ہے، لہٰذا اگر میں اُن کی خدمت نہیں کرتا تو میں اپنے خالق کے تئیں جھوٹا ثابت ہوں گا۔ اگر میں ان کی خدمت کرنا نہیں جانتا تو انسانیت کی خدمت کرنا مجھے کبھی نہیں آئے گا۔ اور اگر میں اپنی قوم کی خدمت کرتے ہوئے دُوسرے ممالک کو نقصان نہیں پہنچاتا تو ظاہر ہے کہ میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ بین الاقوامیت تبھی ممکن ہے جب قوم پرستی حقیقت بن جائے یعنی مختلف ممالک کے افراد اپنے کو متحد کریں اور مکمل اتحاد کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔

قوم پرستی بُری شے نہیں ہے، بُری چیز ہے تنگ نظری، خود غرضی اور الگ تھلگ رہنے کی خواہش، جو موجودہ قوموں کے لیے سب سے بڑی ذلت ہے۔ کوئی بھی شخص قوم پرست ہوئے بغیر بین الاقوامیت کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ ایک قوم دوسری قوم کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ

چاہتی ہے دوسرے کو برباد کر کے اپنی ترقی چاہتی ہے۔ لیکن ہندوستانی قوم پرستی نے ایک نیا راستہ اپنایا ہے۔ وہ انسانی بھلائی اور خدمت کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح منظم کرنا چاہتی ہے اور اپنے خیالات اُن کی ترجمانی کے لیے وقف کرنا چاہتی ہے۔

میرا منتہائے مقصود صرف ہندوستانیوں میں ہی برادرانہ جذبات پیدا کرنا نہیں ہے۔ میرا مقصد صرف ہندوستان کی آزادی ہی نہیں ہے، اگرچہ آج میری ساری زندگی اور وقت بلاشبہ اسی میں صرف ہو رہا ہے۔ تاہم ہندوستان کی آزادی کے حصول کے وسیلے سے میں انسانی بھائی چارے کے منتہائے مقصود کو پانے اور اس کے لیے کام کرنے کی توقع رکھتا ہوں۔ میری حب الوطنی محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے اندر سب کو شامل رکھتی ہے۔ اور میں اُس حب الوطنی کو تسلیم نہیں کرتا، جو دوسروں کو تکلیف پہنچانے اور اُن کے استحصال پر مبنی ہو۔ اس حب الوطنی کی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں جس کا مقصد پوری انسانی برادری کی زیادہ سے زیادہ بھلائی نہیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا مذہب اور میرے مذہب سے پیدا ہوئی حب الوطنی سبھی لوگوں کے لیے ہیں۔

مکمل سوراجیہ سے میری مراد دوسروں سے الگ تھلگ آزادی نہیں، بلکہ صحت مند اور باعزت آزادی ہے۔ اگرچہ میری قوم پرستی شدید ہے لیکن مخصوص لوگوں کے لیے نہیں اور اس کا منتہائے مقصود کسی فرد یا قوم کو نقصان پہنچانا نہیں۔ قانونی ضابطے، اتنے قانونی نہیں ہوتے، جتنے اخلاقی ہوتے ہیں۔ میں اسی ابدی سچائی میں یقین رکھتا ہوں کہ اپنی جائداد کا اس طرح سے استعمال کرو کہ اس سے پڑوسی کی جائداد کو نقصان نہ پہنچے۔

ہماری قوم پرستی سے دوسری قوموں کو خطرہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جس

طرح ہم کسی کو اپنا استحصال نہیں کرنے دیں گے، اسی طرح ہم کسی کا استحصال نہیں کریں گے۔ سوراجیہ کے ذریعے ہم پوری دنیا کی خدمت کریں گے۔

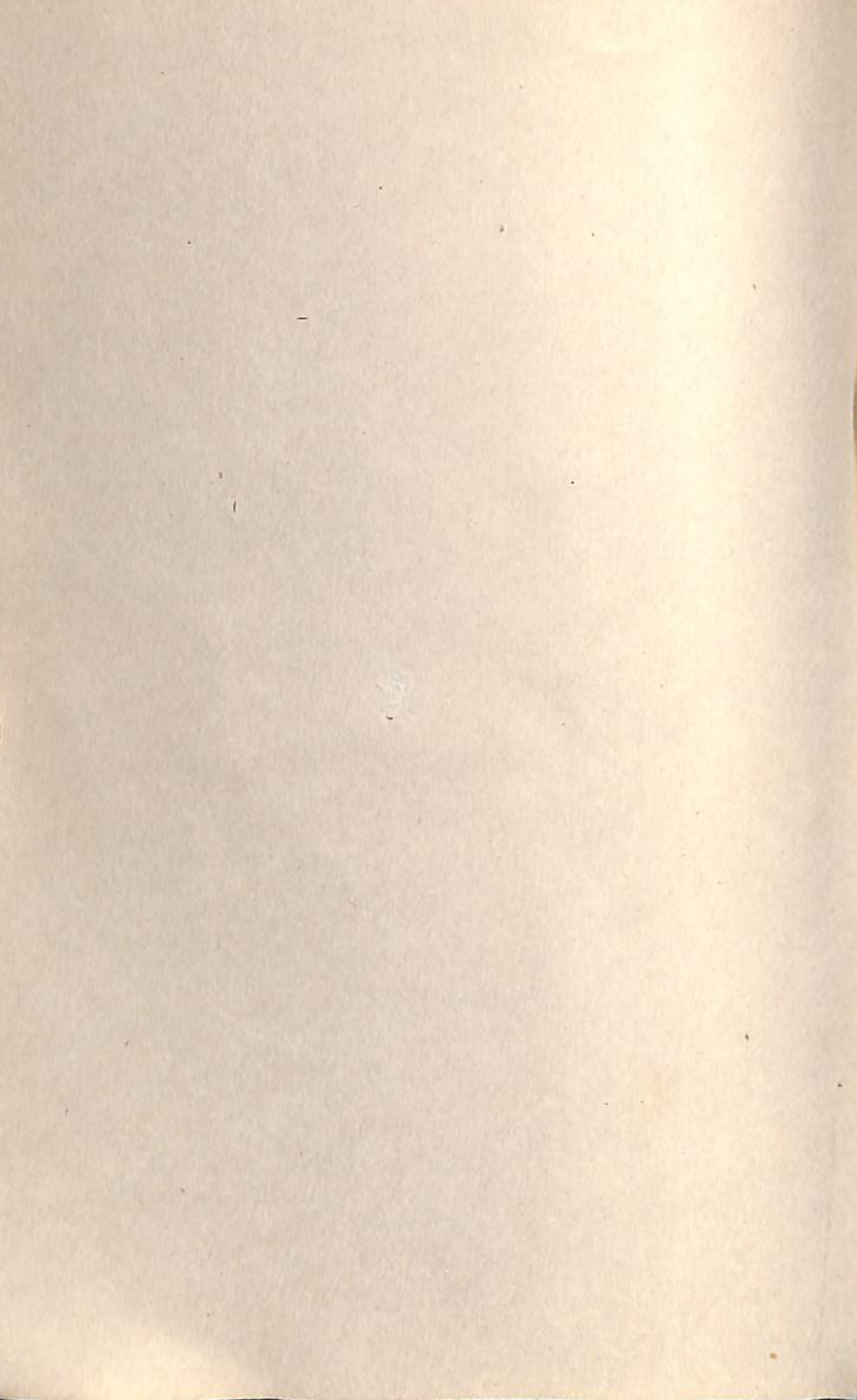
ریاستی حدبندیوں سے اُدھر اپنے پڑوسیوں کی خدمت کرنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ سرحدیں خدا نے نہیں بنائیں۔

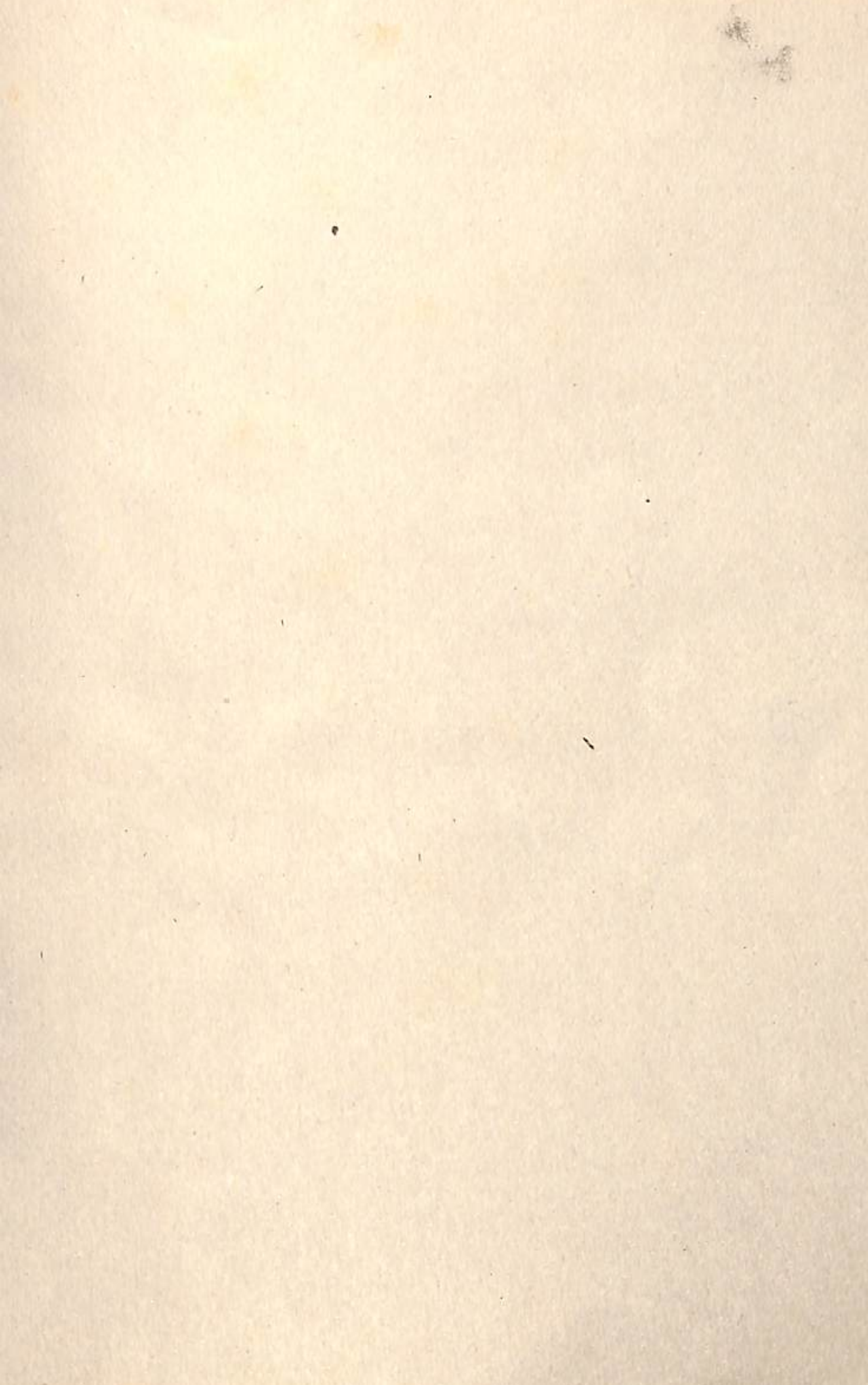
ہم اپنے ملک کے لئے آزادی چاہتے ہیں، مگر دوسروں کا استحصال کرکے یا دوسرے ممالک کو نیچا دکھا کر نہیں۔ مجھے ہندوستان کے لئے ایسی آزادی نہیں چاہئے، جس سے انگلینڈ یا انگریزوں کی تباہی و بربادی ہو۔ میں اپنے ملک کی آزادی اس لئے چاہتا ہوں کہ اس سے دوسرے ممالک میرے آزاد دیش سے کچھ سیکھ سکیں، جس سے میرے ملک کے ذرائع کا انسانی فلاح و بہبود کے لئے استعمال ممکن ہو۔ جیسے قوم پرستی کا اصول آج ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ فرد کو کنبے کے لئے، کنبے کو گاؤں کے لئے، گاؤں کو ضلع کے لئے، ضلع کو صوبے کے لئے اور صوبے کو ملک کے لئے قربانی دینا پڑتی ہے، ویسے ہی ہر ملک کو اسی لئے آزاد ہونا چاہئے کہ وہ ضرورت پڑنے پر دنیا کی بھلائی کے لئے کچھ کر سکے، قربانی دے سکے، لہٰذا قوم پرستی کے تئیں میری محبت یا قوم پرستی سے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ میرا ملک بنی نوع انسان کے لئے اپنے کو وقف کر دے۔ اس میں ذات پات کی نفرت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہماری قوم پرستی ایسی ہی ہونی چاہئے۔

ہم سب اُسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ہم سب ایک بہت بڑے کنبے کے فرد ہیں۔ میں اُن میں کسی طرح کی تفریق کے لئے تیار نہیں۔ مجھے ہندوستانیوں کے دوسروں سے برتر ہونے کا دعویٰ نہیں۔ ہم لوگوں میں ایک ہی طرح کی اچھائیاں

اور بُرائیاں ہیں۔ دُنیا کے لوگ ایسے الگ الگ حصّوں میں بٹے نہیں ہیں کہ ایک دُوسرے کے قریب نہ آسکیں۔ خواہ وہ کہیں رہتے ہوں۔ اس پر بھی وہ سب ایک دُوسرے سے وابستہ ہیں۔ میرا یہ پیغام نہیں ہے کہ ہندوستان سیاہ و سفید کا مالک بن جائے چاہے ساری دُنیا تباہ و برباد ہو جائے۔ ہندوستان پوری طرح سے پھلے پھولے لیکن اُس سے دُنیا کی دوسری قوموں کا بھی بھلا ہو۔ میں ہندوستان کو اور اس کی آزادی کو تبھی برقرار رکھ سکتا ہوں جب میرے دل میں کلّی بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی اور بھلائی کا جذبہ ہو نہ کہ صرف اُن لوگوں کے لئے جو کرۂ ارض کے ایک ایسے چھوٹے سے حصّے میں مقیم ہیں جسے ہندوستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہندوستان دوسرے چھوٹے ممالک کے مقابلے میں کافی بڑا ہے لیکن اس وسیع و عریض دُنیا میں یا کائنات میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

میں یہ بات بہت انکساری کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اگر ہندوستان سچائی اور عدم تشدّد کے ذریعے اپنے منتہائے مقصود تک پہنچتا ہے، تو وہ عالمی امن کے قیام میں بہت بڑا حصّہ ادا کرے گا جس کے لئے دُنیا کی تمام اقوام بے چین ہیں اور اس صورت میں وہ اُس مدد کا تھوڑا سا بدلہ بھی چکا سکے گا جو اُسے اُن اقوام سے بلا معاوضہ ملی ہے۔ اگر میں اپنے ملک کے لئے یہ آزادی چاہتا ہوں تو یقین کیجئے کہ میں یہ آزادی اس لئے نہیں چاہتا کہ میں ایک ایسی قوم کے فرد کی حیثیت سے جس کی آبادی دُنیا کا پانچواں حصّہ ہے۔ دُنیا کی کسی دوسری نسل یا فرد کا استحصال کر سکوں۔ اگر میں اپنے ملک کے لئے آزادی چاہتا ہوں تو میں اس کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک میں تسلیم کر لوں کہ ہر دوسری نسل کو چاہے وہ کمزور ہو یا طاقتور، آزادی کا یکساں حق حاصل ہے۔





پبلیکیشنز ڈویژن
وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ ہند